**Faith and Discovery**
July – Decembe 2026 Vol:4, Issue:2
ISSN(p): 3007-0643
ISSN(e): 3007-0651

# اقبال کی مستقبل شناس بصیرت:
# امتِ مسلمہ کے سیاسی و تہذیبی امکانات کا مطالعہ

*Iqbal's Vision of the Future: A Study of the Political and Civilizational Prospects of the Muslim Ummah*

محمد بابر خان
ایم فل سکالر، امپیریل یونیورسٹی، لاہور

**Abstract**

This research article examines Allama Muhammad Iqbal's visionary insight into the future of the Muslim Ummah as reflected in his poetry, prose writings, speeches, and political thought. Iqbal did not merely interpret the political and civilizational crises of his own age; rather, he anticipated many of the challenges that later confronted the Muslim world. The article explores Iqbal's foresight in relation to the decline of the Ottoman Caliphate, the fragmentation of the Muslim Ummah, the rise of nationalism, the establishment of a separate Muslim state in the Indian subcontinent, the strategic importance of Afghanistan, the civilizational role of Iran, the condition of the Arab world, and the emergence of Israel as a major political challenge for the Muslim world. The study highlights that Iqbal regarded Muslim unity, selfhood, moral revival, political awareness, and adherence to Islamic principles as essential conditions for the reconstruction of the Muslim world. His reflections on Pakistan, Afghanistan, Iran, the Arab world, and

Palestine reveal a deep understanding of global power politics and the long-term consequences of colonial and imperial strategies. The article argues that Iqbal's predictions were not based on mere poetic imagination, but on historical consciousness, spiritual insight, and a profound analysis of the political forces shaping the modern world. In the contemporary context, Iqbal's thought remains highly relevant for understanding the crises of the Muslim Ummah and for seeking a path toward unity, justice, independence, and civilizational revival.

**Keywords:**

Allama Iqbal; Muslim Ummah; Political Foresight; Islamic Revival; Muslim Statehood; Pakistan; Afghanistan; Iran; Arab World; Palestine.

علامہ اقبال کی شاعری اور نثری تحریریں صرف اپنے عہد کی ترجمان نہیں بلکہ مستقبل کے فکری، سیاسی اور تہذیبی امکانات کی بھی بصیرت افروز نشان دہی کرتی ہیں۔ اقبال نے جس عہد میں آنکھ کھولی، اس وقت برصغیر انگریزی استعمار کے زیرِ تسلط تھا۔ مسلمان، جو صدیوں تک سیاسی اقتدار اور تہذیبی عظمت کے حامل رہے تھے، اب محکومی، انتشار اور مایوسی کی کیفیت سے دوچار تھے۔ ان کی اجتماعی قوت کمزور ہو چکی تھی اور امتِ مسلمہ کا وہ سیاسی و روحانی مرکز بھی شکست وریخت کا شکار تھا جو صدیوں تک مسلمانوں کے اتحاد کی علامت سمجھا جاتا رہا۔

بیسویں صدی کے آغاز میں عالمی سیاست نے ایک ایسا رخ اختیار کیا جس نے مسلمانوں کے مستقبل پر گہرے اثرات مرتب کیے۔ جنگِ عظیم اول ۱۹۱۴ء سے ۱۹۱۸ء تک جاری رہی۔ ابتدا میں یہ خیال کیا جا رہا تھا کہ یہ جنگ مختصر مدت میں ختم ہو جائے گی، مگر جرمن اور روسی افواج کے تصادم کے بعد یہ جنگ طول پکڑ گئی اور چار برس تک جاری رہی۔ اس جنگ میں لاکھوں انسان لقمۂ اجل بنے، مگر اس کے نتائج صرف یورپ تک محدود نہ رہے۔ جنگ کے خاتمے کے بعد روس اور مغربی طاقتوں نے عالمی نقشے کی از سرِ نو تقسیم کی، جس کے نتیجے میں ملتِ اسلامیہ کو شدید سیاسی نقصان پہنچا۔ ۱۹۲۰ء کے بعد سلطنتِ عثمانیہ کی شکست وریخت کا عمل تیز ہوا اور بالآخر خلافت کا ادارہ بھی ختم کر دیا گیا۔ اس عمل میں ایسے سیاسی عناصر بھی شریک تھے جو اسلامی اصول و قوانین کے بجائے مغربی تہذیب اور جدید قوم پرستانہ تصورات سے متاثر تھے۔

خلافت کے خاتمے کا براہِ راست اثر ہندوستان کے مسلمانوں پر بھی پڑا۔ برصغیر کے مسلمانوں میں ناامیدی اور بے سہارگی کا احساس شدت اختیار کر گیا۔ امت کا شیرازہ بکھر چکا تھا۔ عرب دنیا، جو کبھی خلافت کے وسیع نظام کا حصہ تھی، چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں تقسیم ہو گئی۔ بعض عرب علیحدگی پسندوں نے اسے اپنی کامیابی سمجھا، مگر حقیقت میں یہ امتِ مسلمہ کے سیاسی اتحاد کے کمزور ہونے کا آغاز تھا۔ اسی دوران وسطی ایشیا کے مسلمان روسی اقتدار کے زیرِ اثر آ گئے، جب کہ ہندوستانی مسلمان پہلے ہی انگریزی غلامی کا شکار تھے۔ خلافت کی علامتی موجودگی سے جو نفسیاتی سہارا باقی تھا، وہ بھی ختم ہو گیا۔

اس عہد کی سیاسی تبدیلیوں نے یہ حقیقت واضح کر دی کہ مسلمانوں کے اتحاد کو کمزور کرنا استعماری قوتوں کی بڑی حکمتِ عملی کا حصہ تھا۔ خلافت اگرچہ اپنے آخری زمانے میں کمزور ہو چکی تھی، تاہم وہ امت کے اجتماعی شعور اور وحدت کی علامت ضرور تھی۔ جب تک یہ علامت موجود تھی، مسلمانوں میں کسی حد تک وحدت کا احساس باقی تھا۔ اسی لیے مسلمانوں کے دل و دماغ میں ملت کے بجائے وطنیت، قومیت اور علاقائی شناختوں کو غالب کیا گیا تاکہ امت کو مختلف خانوں میں تقسیم کر کے اس پر حکومت آسان بنائی جا سکے۔ وقت نے ثابت کیا کہ اس تقسیم نے مسلمانوں کو سیاسی، تہذیبی اور فکری سطح پر شدید نقصان پہنچایا۔

ان تبدیلیوں سے غیر مسلم استعماری طاقتوں اور خود مسلم دنیا کے آزاد خیال حکمرانوں نے فائدہ اٹھایا۔ سرمایہ دارانہ قوتیں مختلف ملکوں پر اثر انداز ہوئیں، نئے سیاسی نظام قائم ہوئے، اور جمہوریت، قومیت اور بادشاہت کے نام پر مسلمانوں کی اجتماعی قوت منتشر ہوتی چلی گئی۔ ترکی نے مغربی طرزِ سیاست کو اختیار کیا، عرب ممالک نے بھی مغرب کی پیروی میں اپنے سیاسی راستے متعین کیے، مگر نتیجہ یہ نکلا کہ امت عرب و عجم، افریقی، ہندوستانی، ایرانی، ترک اور دیگر شناختوں میں بٹتی چلی گئی۔ ہر خطہ اپنے مقامی مفادات میں گرفتار ہو گیا۔ کہیں مغربی طاقتیں حاکم بنیں، کہیں روسی اثرات غالب آئے، اور کہیں داخلی بادشاہتوں نے حقِ حکمرانی کو مخصوص خاندانوں کی میراث بنا دیا۔ اس صورتِ حال کو اقبال نے نہایت گہری بصیرت سے محسوس کیا اور اپنے کلام میں اس خطرناک فکری و سیاسی رخ کی طرف اشارہ کیا:

فکر عرب کو دے کے فرنگی تخیلات
اسلام کو حجاز و یمن سے نکال دو

(اقبال، اردو: ص۶۵۸)

علامہ اقبال کو اللہ تعالیٰ نے ایسے زمانے میں پیدا کیا جب مسلمان فکری جمود، سیاسی محکومی اور تہذیبی انتشار کا شکار تھے۔ اقبال کا وجود ہندوستانی مسلمانوں ہی کے لیے نہیں بلکہ پوری امتِ مسلمہ کے لیے ایک عظیم نعمت ثابت ہوا۔ وہ محض شاعر نہیں تھے، بلکہ ایک عظیم مفکر،

بصیرت افروز مصلح اور ملت کے مستقبل شناس راہنما تھے۔ انہوں نے قوموں کے مزاج، تہذیبوں کے تصادم، سیاسی قوتوں کی چالوں اور ملتِ اسلامیہ کے داخلی ضعف کو گہری نظر سے دیکھا۔ ان کی شاعری اور تحریروں میں صرف حال کا مرثیہ نہیں، بلکہ مستقبل کی واضح تنبیہات، اشارے اور پیش گوئیاں بھی موجود ہیں۔

اقبال نے غلامی کے دور میں بھی آزاد انسان کی طرح سوچا اور لکھا۔ قابض حکمرانوں کی ظالمانہ پالیسیوں پر تنقید کی، اپنی ملت کی خودی کو جگایا، مسلمانوں میں امید، حرکت اور بیداری پیدا کی، اور انہیں یہ احساس دلایا کہ زوال ان کا مقدر نہیں بلکہ بیداری، اتحاد اور خودشناسی کے ذریعے وہ دوبارہ اپنی کھوئی ہوئی عظمت حاصل کر سکتے ہیں۔ اقبال کی فکر کا دائرہ صرف ہندوستان تک محدود نہ تھا؛ وہ پوری امتِ مسلمہ کے درد کو اپنے دل میں محسوس کرتے تھے۔ فلسطین، کشمیر، افغانستان، ایران، عرب دنیا اور ہندوستان کے مسلمان—سب ان کی فکری توجہ کا مرکز تھے۔ وہ جہاں کہیں امت کو کمزور، منتشر یا بے سمت دیکھتے، وہاں ان کا دل تڑپ اٹھتا۔

شیرازہ ہوا ملتِ مرحوم کا ابتر
اب تو ہی بتا، تیرا مسلمان کدھر جائے!
وہ لذتِ آشوب نہیں بحرِ عرب میں
پوشیدہ جو ہے مجھ میں، وہ طوفان کدھر جائے

(اقبال، اردو: ص۵۶۱)

ان اشعار میں اقبال ملتِ اسلامیہ کے منتشر شیرازے پر نوحہ کناں ہیں۔ وہ عربوں کی غیرت، خودداری، شجاعت اور مرکزیت کو یاد کرتے ہیں اور سوال اٹھاتے ہیں کہ جب امت کا مرکزی خطہ ہی بے حسی، انتشار اور کمزوری کا شکار ہو جائے تو باقی مسلمان کس طرف جائیں؟ عرب دنیا امتِ مسلمہ کا روحانی اور تاریخی مرکز رہی ہے؛ اگر وہی اتحاد سے محروم ہو جائے تو ملت کے اجتماعی مستقبل پر سوالیہ نشان لگ جاتا ہے۔ اقبال نے اس صورتِ حال کو محض ایک وقتی سیاسی حادثہ نہیں سمجھا بلکہ اسے مستقبل کے بڑے خطرات کی تمہید کے طور پر دیکھا۔ یہی

وجہ ہے کہ ان کے کلام اور تحریروں میں بار بار وہ بصیرت سامنے آتی ہے جو آنے والے زمانوں کے سیاسی، تہذیبی اور فکری بحرانوں کی پیشگی خبر دیتی ہے۔

اقبال کی عظمت کا ایک اہم پہلو یہی ہے کہ انہوں نے اپنے عہد کے واقعات کو سطحی سیاسی تبدیلیوں کے طور پر نہیں دیکھا، بلکہ ان کے پس منظر میں کارفرما تہذیبی قوتوں، فکری رجحانات اور عالمی طاقتوں کے عزائم کو پہچانا۔ ان کی نظر حال کے پردے سے گزر کر مستقبل کے امکانات تک پہنچتی تھی۔ اس لیے اقبال کی پیش گوئیوں کا مطالعہ محض ادبی یا شعری مطالعہ نہیں، بلکہ امتِ مسلمہ کی فکری تاریخ، سیاسی بصیرت اور تہذیبی شعور کو سمجھنے کا ایک اہم ذریعہ ہے۔ زیرِ نظر مقالے میں اقبال کے کلام اور ان کی تحریروں میں موجود انہی مستقبل شناس اشاروں، تنبیہات اور پیش گوئیوں کا جائزہ لیا جائے گا تاکہ یہ واضح کیا جا سکے کہ اقبال نے اپنے عہد کے آئینے میں آنے والے زمانوں کی تصویر کس طرح دیکھی اور ملتِ اسلامیہ کو کن خطرات، امکانات اور ذمہ داریوں کی طرف متوجہ کیا۔

## اقبال کی پیش گوئی اور مسلم ریاست کا قیام

برصغیر پاک و ہند میں مسلمان عددی اعتبار سے اقلیت میں تھے، لیکن ان کی سیاسی، معاشی اور تہذیبی کمزوری کا سبب صرف اقلیت ہونا نہیں تھا۔ ان کی بدحالی کے پیچھے کئی تاریخی، سماجی اور سیاسی عوامل کارفرما تھے، جن کا ذکر پہلے کیا جا چکا ہے۔ علامہ اقبال نے اپنی شاعری، نثر اور خطبات کے ذریعے برصغیر کے مسلمانوں کو بیدار کرنے کی مسلسل کوشش کی۔ وہ چاہتے تھے کہ مسلمان محض ماضی کی عظمت کے ماتم میں مبتلا نہ رہیں، بلکہ موجودہ حالات میں عملی کردار ادا کریں، سیاست میں حصہ لیں، اجتماعی معاملات کو سنبھالیں اور اپنی قومی و ملی زندگی کی تشکیلِ نو کریں۔

اقبال کے نزدیک مسلمانوں کے لیے ہمیشہ کی غلامی قبول کر لینا کسی صورت قابلِ قبول نہ تھا۔ وہ سمجھتے تھے کہ اگر پورے ہندوستان میں مسلمانوں کے لیے اقتدار کا حصول ممکن نہیں تو

کم از کم مسلم اکثریتی علاقوں میں ایک ایسی خود مختار حکومت قائم ہونی چاہیے جو مسلمانوں کی دینی، تہذیبی اور سیاسی شناخت کی محافظ بن سکے۔ یہ کام آسان نہیں تھا۔ برطانوی حکومت بھی اس تصور کی حامی نہ تھی اور ہندو قیادت بھی یہ نہیں چاہتی تھی کہ مسلمان کسی علیحدہ نظامِ حکومت کی طرف بڑھیں۔ دونوں طاقتیں اپنے اپنے تاریخی پس منظر کے باعث مسلمانوں کے سیاسی احیا سے خائف تھیں۔ برطانیہ کو سلطنتِ عثمانیہ اور عالمی اسلامی قوت سے خطرہ تھا، جب کہ ہندو قیادت کے ذہن میں مسلم عہدِ حکومت، خصوصاً مغلیہ دور، ایک تاریخی رنجش کے طور پر موجود تھا۔ اس فضا میں اقبال کی سیاسی بصیرت غیر معمولی اہمیت اختیار کر جاتی ہے۔

اقبال کی دور اندیشی کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ انہوں نے آل انڈیا مسلم لیگ کے الہ آباد اجلاس کے صدارتی خطبے میں مسلمانوں کے لیے ایک جداگانہ سیاسی وحدت کا تصور پیش کیا۔ انہوں نے فرمایا:

> میں چاہوں گا کہ پنجاب، شمال مغربی سرحدی صوبہ، سندھ اور بلوچستان کو ضم کر کے ایک واحد ریاست بنا دیا جائے اور اسے خود مختاری دی جائے۔ برطانوی سلطنت کے اندر یا برطانوی سلطنت کے باہر شمال مغربی ہندی مسلمانوں کی ایک مستحکم ریاست کا قیام مسلمانوں کی حتمی تقدیر نظر آتی ہے۔ (صدیقی، ص۲۹)

یہ محض ایک سیاسی تجویز نہ تھی، بلکہ اقبال کی مستقبل شناس نگاہ کا اظہار تھا۔ انہوں نے جس مسلم ریاست کا تصور پیش کیا، وہ ان کے خطبے کے سترہ سال بعد اور ان کی وفات کے تقریباً نو سال بعد پاکستان کے نام سے معرضِ وجود میں آئی۔ آج جس جغرافیائی خطے میں پاکستان قائم ہے، اس کے بنیادی خدوخال اقبال کے اسی تصور سے ہم آہنگ دکھائی دیتے ہیں۔ علامہ اقبال اور قائداعظم محمد علی جناح دونوں کی خواہش یہی تھی کہ یہ ریاست مسلمانوں کی دینی، تہذیبی اور اجتماعی زندگی کے تحفظ کا مرکز بنے اور یہاں اسلامی اصولوں کے مطابق عدل، مساوات اور فلاح کا نظام قائم ہو۔

قیامِ پاکستان کے بعد ہندوستان کے مختلف صوبوں اور ریاستوں سے مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد نے ہجرت کی۔ یہ ہجرت محض جغرافیائی نقل مکانی نہ تھی، بلکہ اسلام کے نام پر کی جانے والی ایک عظیم قربانی تھی۔ لاکھوں مسلمانوں نے جانوں، مالوں اور عزتوں کی قربانیاں دے کر پاکستان کا رخ کیا۔ ان کے دلوں میں یہ امید تھی کہ خلافت کے خاتمے کے بعد اب انہیں ایک ایسا ملک میسر آئے گا جہاں اللہ کا قانون نافذ ہو گا، عدل و انصاف قائم ہو گا، ظلم و جبر کا خاتمہ ہو گا اور عزت و آبرو محفوظ رہے گی۔

در حقیقت پاکستان کے قیام کا بنیادی مقصد یہی تھا کہ اسے اسلامی اصولوں پر قائم ایک مثالی ریاست کے طور پر دنیا کے سامنے پیش کیا جائے۔ یہ ریاست عالمِ اسلام کے لیے مشعلِ راہ بن سکتی تھی اور مغربی طاقتوں کے سامنے ایک متبادل تہذیبی نمونے کے طور پر ابھر سکتی تھی۔ مگر افسوس کہ اسلامی جمہوریہ پاکستان کو قائم ہوئے ۷۸ سال بیت چکے ہیں، لیکن نہ اس کی بنیادیں مکمل طور پر اسلامی اصولوں پر استوار ہو سکیں اور نہ وہ ظلم و جبر ختم ہو سکا جس سے نجات کے لیے یہ ملک بنایا گیا تھا۔ متحدہ ہندوستان میں انگریزوں نے جو سرمایہ دارانہ اور جاگیر دارانہ نظام قائم کیا تھا، وہ پاکستان میں بھی نہ صرف باقی رہا بلکہ وقت کے ساتھ زیادہ مضبوط ہوتا چلا گیا۔ نتیجتاً ایک مخصوص طبقہ امیر سے امیر تر ہوتا گیا اور ملک کی بڑی آبادی غربت، محرومی اور عدمِ انصاف کا شکار رہی۔

تاہم اقبال امید کے شاعر ہیں۔ وہ زندگی کو عمل، جدوجہد اور خودی کے ذریعے بدلنے پر یقین رکھتے ہیں۔ جس طرح انہوں نے پاکستان کے قیام سے کئی برس پہلے اس کے جغرافیائی اور سیاسی امکانات کی نشان دہی کی، اسی طرح انہیں اس بات پر بھی یقین تھا کہ یہ خطہ ایک دن عالمِ اسلام کے لیے مرکزیت اختیار کر سکتا ہے۔ اقبال نے اپنی علمی اور روحانی بصیرت سے فرمایا:

میر عرب کو آئی ٹھنڈی ہوا جہاں سے
میرا وطن وہی ہے، میرا وطن وہی ہے

(اقبال، اردو: ص ۱۱۴)

یہ شعر ایک ایسی اسلامی ریاست کے تصور سے وابستہ محسوس ہوتا ہے جس کا قیام تاریخ کے دھارے میں ناگزیر تھا۔ اسی مفہوم کے ساتھ ایک روایت بھی منسوب کی جاتی ہے کہ نبی پاک ﷺ نے فرمایا کہ مجھے مشرق سے ٹھنڈی ہوا آتی ہے۔ اس سے یہ اشارہ لیا گیا کہ مشرق میں ایک ایسا خطہ ظہور پذیر ہو گا جو حقیقی معنوں میں اسلام کا قلعہ بن سکے گا۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ اسلامی قوانین کو عملی طور پر نافذ کیا جائے اور مغرب کی ظاہری چمک دمک سے متاثر ہو کر اس نظامِ حیات کو ترک نہ کیا جائے جسے اسلام نے پوری انسانیت کی فلاح کے لیے پیش کیا ہے۔

اقبال کی دور اندیشی نے جس طرح مسلم ریاست کے قیام کو محسوس کر لیا تھا، اسی طرح ان کا یہ تصور بھی ایک زندہ امکان کے طور پر موجود ہے کہ پاکستان ایک دن حقیقی معنوں میں فلاحی اسلامی ریاست بن کر پوری امت کے لیے رہنمائی کا مرکز بنے۔ موجودہ حالات کو دیکھتے ہوئے بظاہر اس پر یقین کرنا مشکل معلوم ہوتا ہے، کیونکہ سرمایہ دارانہ نظام، اشرافیہ کی لوٹ مار اور مغربی سیاسی و معاشی ڈھانچوں نے اس ریاست کو کمزور کر دیا ہے۔ لیکن دنیا بھر میں اس نظام کے خلاف آوازیں بلند ہو رہی ہیں۔ خاص طور پر مسلم ممالک کا متوسط طبقہ معاشی اور معاشرتی انصاف کا مطالبہ کر رہا ہے۔ اس تناظر میں یہ امکان پھر روشن ہوتا ہے کہ مشرق ہی سے ایسی اسلامی حکومتوں کا قیام ہو جو امت کے اتحاد، عدل اور فلاح کی بنیاد بن سکیں۔ افغانستان میں امریکہ کی شکست کے بعد قائم ہونے والی اسلامی حکومت کو بھی بعض اہلِ نظر اسی بڑے تاریخی عمل کی ایک کڑی سمجھتے ہیں۔

## علامہ اقبال کی پیش گوئیاں اور افغانستان

علامہ اقبال جس قدر ہندوستان کے مسلمانوں کے لیے فکر مند تھے، اسی قدر انہیں عالمِ اسلام کے دیگر خطوں کی بدحالی کا بھی احساس تھا۔ افغانستان سے انہیں خاص دلچسپی اور دلی تعلق تھا۔ انہوں نے اپنی فارسی شاعری میں افغان قوم کا ذکر بار بار کیا اور اسے اس کے شاندار ماضی، غیرت، خودداری اور دینی حمیت کی یاد دلائی۔ ہندوستان میں افغان سفیر جناب صلاح الدین

سلجوقی علامہ اقبال کو اپنا مرشد مانتے تھے۔ ۱۹۲۹ء میں جب نادر شاہ نے کابل یونیورسٹی کی بنیاد رکھی تو ہندوستان سے ماہرینِ تعلیم کو دعوت دی گئی۔ علامہ اقبال بھی اس خصوصی دعوت پر افغانستان گئے، جہاں کابل میں ان کا شاندار استقبال کیا گیا۔ علامہ اقبال اور نادر شاہ کے درمیان نہایت قریبی اور برادرانہ تعلق تھا۔

اسی دورے کے دوران اقبال نے افغانوں کے لیے کہا تھا: ”اے آب و گل سے بنے ہوئے لوگو! میرے گرد جمع ہو جاؤ، میں، میرے سینے میں جو درد ہے، وہ تمہارے ہی اجداد سے لیا ہوا ہے۔ مغرب کی چمک دمک کا تم پر کوئی اثر نہیں ہے۔“

افغان قوم کی تاریخ اس حقیقت کی گواہ ہے کہ اس نے بیرونی حملہ آوروں کے سامنے کبھی آسانی سے سرِ تسلیم خم نہیں کیا۔ یورپی طاقتیں ہوں یا سوویت یونین، جس نے بھی افغانستان کو مغلوب کرنے کی کوشش کی، اسے سخت مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا۔ سوویت یونین نے مشرقی اور وسطی ایشیا کے کئی خطوں کو اپنے اثر میں لیا، مگر جب افغان قوم اس کے خلاف اٹھ کھڑی ہوئی تو دنیا نے دیکھا کہ ایک عالمی طاقت کس طرح شکست سے دوچار ہوئی اور بالآخر ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو گئی۔ ان بڑی طاقتوں نے افغانوں کے نظریات کو بدلنے، انہیں دین سے دور کرنے اور نئے عالمی نظام کا حصہ بنانے کی کوشش کی، مگر افغان معاشرے کی دینی جڑیں، قبائلی نظام، پردہ، حیا، غیرت اور روایتی خودداری ان کوششوں کے سامنے مضبوط دیوار ثابت ہوئیں۔

افغانیوں کی غیرت دیں کا ہے یہ علاج
ملا کو ان کے کوہ و دمن سے نکال دو

(اقبال، اردو: ص۶۵۸)

افغانوں کی غیرت، ایمان اور بہادری کو جس نے بھی للکارا، وہ تاریخ میں عبرت کا نشان بنا۔ اقبال کی خواہش تھی کہ بادشاہ امان اللہ مسلمانانِ عالم کی قیادت میں ایک کردار ادا کریں۔ عرب اور ترک دنیا کا ایک بڑا حصہ مغربی طاقتوں اور جدید تہذیب کی پیروی کی طرف مائل ہو چکا

تھا، خلافت کا ادارہ ختم ہو چکا تھا، اور ہندوستان کے مسلمان انگریزی غلامی میں مبتلا تھے۔ ایسے میں افغانستان وہ خطہ تھا جس نے اپنی غیرت، حمیت اور جداگانہ دینی مزاج کا سودا نہیں کیا تھا۔

اقبال افغانستان کو ایشیا کا دل قرار دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک اگر اس دل میں خرابی پیدا ہو جائے تو پورے ایشیا کے جسم میں اضطراب پھیل جاتا ہے۔ جس طرح دل پورے جسم کو خون فراہم کرتا ہے، اسی طرح افغانستان اپنی جغرافیائی، تہذیبی اور روحانی حیثیت کے باعث پورے ایشیا کے استحکام میں بنیادی کردار رکھتا ہے۔ اگر افغانستان میں امن ہو تو ایشیا میں امن کے امکانات روشن ہوتے ہیں، اور اگر افغانستان فساد اور جنگ کا شکار ہو تو اس کے اثرات پورے خطے پر مرتب ہوتے ہیں۔ اقبال نے ایک صدی قبل یہ حقیقت بیان کی تھی، اور آج کی تاریخ اس کی صداقت پر گواہ ہے۔

آسیا یک پیکر آب و گل است
ملّت افغان در آن پیکر دل است
از فساد او فساد آسیا
در گشاد او گشاد آسیا
تا دل آزاد است آزاد است تن
ورنہ کاہی در رہ باد است تن

(اقبال، فارسی: ص ۷۶۵-۷۶۶)

" ایشیا ایک بدن ہے اور افغان قوم اس کا دل ہے۔ اگر دل میں بگاڑ ہو گا تو ایشیا میں بگاڑ ہو گا۔ اس کے بناؤ میں ایشیا کا بناؤ ہے۔ اگر دل آزاد ہو گا تو بدن بھی آزاد ہو گا، ورنہ بدن ہوا کے راستے میں پڑا ہوا ایک تنکا ہے۔"

ان اشعار میں اقبال نے پورے ایشیا کو ایک جسم قرار دیا ہے اور افغان قوم کو اس جسم کا دل کہا ہے۔ اس استعارے میں افغانستان کی جغرافیائی، تہذیبی اور سیاسی اہمیت نہایت بلیغ انداز میں بیان ہوئی ہے۔ اقبال کے نزدیک اگر دل آزاد، بیدار اور سلامت ہو تو پورا جسم قوت اور

زندگی حاصل کرتا ہے؛ لیکن اگر دل ہی فساد، غلامی یا کمزوری کا شکار ہو جائے تو پورا جسم بے جان تنکے کی طرح ہواؤں کے رحم و کرم پر رہ جاتا ہے۔ افغانستان کی جغرافیائی حیثیت بھی اس فکر کو تقویت دیتی ہے، کیونکہ یہ خطہ وسطی ایشیا، جنوبی ایشیا اور مشرقِ وسطیٰ کے درمیان ایک اہم رابطہ گاہ کی حیثیت رکھتا ہے۔

۱۹۱۹ء میں افغانوں نے انگریز حکومت کے خلاف جنگ کر کے آزادی حاصل کی۔ بعد ازاں جب برصغیر سے انگریزوں کا اقتدار ختم ہوا تو ایشیا میں سوویت یونین ایک نئی عالمی طاقت کے طور پر ابھرا۔ اس نے وسطی ایشیا کے متعدد اسلامی اور غیر اسلامی خطوں پر قبضہ کیا اور اپنے اثرات کو افغانستان تک پھیلانا چاہا۔ سوویت یونین کا ایک بڑا مقصد گرم پانیوں تک رسائی بھی تھا۔ روس اپنی جغرافیائی سردی اور تجارتی مشکلات کے باعث جنوب کی طرف راستہ چاہتا تھا، اور افغانستان کے بعد پاکستان اس کے لیے اہم ہدف بن سکتا تھا۔

جب سوویت یونین افغانستان میں داخل ہوا تو اسے افغان قوم کی سخت مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا۔ افغانوں نے کبھی غلامی کو قبول نہیں کیا تھا۔ ان کی دینی وابستگی، قبائلی غیرت، سادہ طرزِ زندگی اور روایتی خود مختاری ان کی قوت کا سرچشمہ تھیں۔ سوویت یونین ایک سیکولر نظام کا علم بردار تھا اور وہ اسی نظام کو دنیا کے مختلف خطوں میں پھیلانا چاہتا تھا، مگر افغانستان میں اسے ایک ایسی قوم کا سامنا کرنا پڑا جس کی جڑیں اسلام اور آزادی کے تصور سے مضبوطی کے ساتھ وابستہ تھیں۔

افغانستان کے حالات کو دیکھتے ہوئے امریکہ، جو اس وقت ایک ابھرتی ہوئی عالمی طاقت تھا، نے افغان مزاحمت کی مدد کا فیصلہ کیا تاکہ سوویت یونین کو روکا جا سکے۔ پاکستان، جو اس وقت سوویت توسیع پسندی کے خطرے سے دوچار تھا، اس جنگ میں ایک اہم کردار ادا کرنے پر مجبور ہوا۔ پاکستان نے امریکی امداد کو افغانستان تک پہنچانے کا ذریعہ بنایا اور افغانوں کی جدوجہد میں عملی طور پر شریک ہوا۔ یہ جنگ طویل تھی، مگر افغانوں نے ہمت نہ ہاری۔ سرکاری اعداد و شمار کے مطابق اس جنگ میں ۱۳ لاکھ افغانوں نے جانوں کے نظرانے پیش کیے، مگر اس

قوم نے پیچھے ہٹنا قبول نہ کیا۔ اقبال افغانوں کی اس جرات اور بہادری کو بہت پہلے محسوس کر چکے تھے:

ملّتِ آوارۂ کوہ و دمَن

در رگِ او خونِ شیران موج زن

(اقبال، فارسی: ص۱۸۸)

"کوہ و دمن میں بکھری ہوئی افغان قوم، جس کی رگوں میں شیروں کا خون ٹھاٹھیں مارتا ہے۔"

یہی وہ قوم تھی جس نے دنیا کی دوسری بڑی طاقت سوویت یونین کو شکست دی۔ پہاڑوں میں آباد قبائلی ساخت رکھنے والی اس قوم نے اتحاد، جرات اور دینی جذبے کے ساتھ ایک سپر پاور کو پسپا کر دیا۔ پاکستان نے بھی اس جنگ کو افغانستان تک محدود رکھنے میں اہم کردار ادا کیا۔ پاکستانی مجاہدین نے بڑی تعداد میں افغان بھائیوں کا ساتھ دیا، جنگی حکمت عملی سے لے کر وسائل اور دیگر امداد تک اپنا حصہ ڈالا۔ ایک مسلمان کا دوسرے مسلمان کی مصیبت میں ساتھ دینا اور اسلام کے حکم کے مطابق قربانی دینا اس جنگ میں نمایاں طور پر دکھائی دیا۔

سوویت یونین کے خطرناک عزائم خاک میں مل گئے، پاکستان کا دفاع بھی ایک حد تک محفوظ ہوا، اور دنیا نے دیکھا کہ ایک عالمی طاقت ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو گئی۔ البتہ اس کامیابی کا سب سے زیادہ سیاسی فائدہ امریکہ کو پہنچا۔ سوویت یونین کے خاتمے کے بعد امریکہ دنیا کی واحد سپر پاور کے طور پر سامنے آیا اور اپنے عالمی مفادات کے لیے مختلف خطوں میں مداخلت کرنے لگا۔ افغان روس جنگ کے بعد بڑی تعداد میں افغان شہریوں نے ہجرت کی اور پاکستان میں آباد ہوئے۔ پاکستان نے ان مہاجرین کو پناہ، رہائش اور بنیادی سہولیات فراہم کیں۔ یہ وہ دور تھا جب پاک افغان بھائی چارہ نمایاں طور پر سامنے آیا۔

اس مختصر دور میں محسوس ہوا کہ شاید اب ایشیا امن کی طرف بڑھے گا اور جنگ زدہ خطے خوشحالی کی راہ پر گامزن ہوں گے۔ افغانوں نے بھی طویل جنگ کے بعد اپنے ملک کی تعمیر و ترقی کا خواب دیکھا۔ انہی برسوں میں افغانستان میں اسلامی حکومت کے قیام کی کوششیں بھی ہوئیں، جو افغان عوام کی ایک بڑی تعداد کی خواہش تھی۔ افغان قوم خوددار، بہادر اور اسلامی اصولوں سے قریب زندگی گزارنے والی قوم ہے۔ ان کی روایات میں پردہ، حیا، مہمان نوازی، دینی تعلیم اور معاشرتی غیرت کو بنیادی حیثیت حاصل رہی ہے۔ مدارس ان کی تعلیم و تربیت کا اہم ذریعہ رہے، تاہم نئی نسل جدید علوم، ٹیکنالوجی اور طب کے حصول کی خواہش بھی رکھتی تھی۔

عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ افغان قوم جدید دنیا سے کٹی ہوئی ہے اور قدیم طرزِ زندگی سے باہر نہیں آ سکتی، لیکن حقیقت اس سے مختلف ہے۔ افغان نوجوان ہر دور کے نئے تقاضوں کو اسلامی اصولوں کے مطابق اپنا کر آگے بڑھنا چاہتے ہیں۔ علامہ اقبال نے اپنے دورۂ افغانستان کے حوالے سے اسی حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا:

> "افغانوں کی نوجوان نسل جدید علم حاصل کرنے اور اسے اپنے مذہب اور اپنی ثقافت کے مطابق ہم آہنگ کرنے کی شدید خواہش رکھتی ہے۔ افغان ایک نفیس اور باوقار قوم ہیں، اور ہندی ہونے کے ناتے ہمارا یہ فرض ہے کہ ہم ان کی مدد کریں تاکہ وہ جس قدر ترقی کرنا چاہتے ہیں، کر سکیں۔ (صدیقی، ص۳۰۹)

یہ ایک فطری امر ہے کہ جو قوم طویل جنگ اور سخت حالات سے گزرتی ہے، اس کے نوجوانوں میں ترقی، خوشحالی اور تعمیرِ نو کی خواہش مزید شدید ہو جاتی ہے۔ مگر بدقسمتی سے افغانستان میں یہ عمل زیادہ دیر تک مستحکم نہ رہ سکا۔ سوویت قبضے کا خاتمہ ۱۹۸۹ء میں ہو چکا تھا، لیکن اس کے بعد داخلی خانہ جنگی نے ملک کو مزید کئی برس تک متاثر کیا۔ ۱۹۹۶ء میں افغان طالبان نے کابل پر قبضہ کر کے اسلامی حکومت قائم کی۔ اس کے بعد ملک میں نسبتاً امن قائم ہوا، خوشحالی

کے آثار پیدا ہوئے، اور اسلامی اصولوں پر مبنی نظام کے ذریعے انصاف، روزگار اور بنیادی تعلیم کے انتظامات کیے گئے۔ اس صورتِ حال پر متوسط اور غریب طبقے نے اطمینان کا اظہار کیا۔

لیکن یہ استحکام زیادہ دیر قائم نہ رہ سکا۔ ۱۱ر ستمبر ۲۰۰۱ء کو امریکہ میں ہونے والے حملے کے بعد امریکہ نے اس کا ذمہ دار طالبان افغانستان کو قرار دیا اور اپنے اتحادیوں کے ساتھ افغانستان پر حملہ کر دیا۔ یہ جنگ ایک بار پھر پورے ایشیا کے امن کو متاثر کرنے والی ثابت ہوئی۔ امریکہ نے ایشیائی ممالک کو واضح پیغام دیا کہ جو اس جنگ میں اس کا ساتھ نہیں دے گا، اسے بھی افغانستان جیسی صورتِ حال کا سامنا کرنا پڑ سکتا ہے۔ پاکستان چونکہ افغانستان کا پڑوسی ملک ہے، اس لیے جنگ کی تباہ کاریوں کے اثرات براہِ راست اس پر بھی مرتب ہوئے۔

یہاں اقبال کی وہ پیش گوئی پوری ہوتی دکھائی دیتی ہے کہ افغانستان میں امن ہو گا تو ایشیا میں امن ہو گا، اور افغانستان میں فساد ہو گا تو پورا خطہ اضطراب کا شکار ہو گا۔ یہ جنگ بظاہر امریکہ اور افغانستان کے درمیان تھی، مگر اس کی زد میں پورا خطہ آ گیا۔ پاکستان کے لیے صورتِ حال نہایت پیچیدہ تھی۔ اگر وہ امریکہ کا ساتھ نہ دیتا تو ہندوستان اس موقع سے فائدہ اٹھا کر امریکہ کی مدد سے پاکستان پر دباؤ بڑھا سکتا تھا؛ اور اگر پاکستان امریکہ کا ساتھ دیتا تو افغانستان کے ساتھ اس کے دیرینہ دینی، تاریخی اور برادرانہ تعلقات متاثر ہوتے۔ اس وقت پاکستان میں جنرل پرویز مشرف کی حکومت تھی، جس نے نعرہ لگایا: "سب سے پہلے پاکستان"۔ اس کے بعد جنگ کا مرکز اگرچہ افغانستان رہا، لیکن اس جنگ میں استعمال ہونے والی رسد اور راستوں کا بڑا حصہ پاکستان سے وابستہ ہو گیا۔

امریکہ افغانستان کی اس طویل جنگ میں پاکستان کو بھی بہت بڑے جانی اور مالی نقصان سے گزرنا پڑا۔ افغان قبائل، جو روس افغان جنگ میں پاکستان کی مدد کے باعث بھائیوں کی طرح سمجھے جاتے تھے، امریکہ کے ساتھ تعاون کی وجہ سے پاکستان سے بدظن ہونے لگے۔ بیس سالہ افغان امریکہ جنگ، جس میں نیٹو ممالک بھی شامل تھے، بالآخر امریکہ کی شکست پر منتج ہوئی۔ اس کے بعد بظاہر یہ امید پیدا ہوئی کہ اب خطے میں امن قائم ہو گا، کیونکہ جنگ کی فوری وجہ باقی نہ

رہی تھی۔ تاہم پاکستان اور ہندوستان کے درمیان کشمیر کا مسئلہ اب بھی ایک مستقل جنگی ماحول پیدا کیے رکھتا ہے۔ پاکستان نے جب بھی ہندوستان کی جانب سے مسلط کی جانے والی جارحیت کا سامنا کیا، پوری قوم متحد ہو کر اس کے مقابلے میں کھڑی ہوئی۔

علامہ اقبال کے زمانے میں افغانستان اور ہندوستان کے مسلمانوں کے درمیان جو محبت، احترام اور دینی قربت پائی جاتی تھی، وہ اقبال کے افغانوں سے دلی لگاؤ کا ایک اہم سبب تھی۔ مگر وقت کے ساتھ حالات بدلتے گئے۔ ایک صدی بعد پاکستان اور افغانستان دو الگ ملکوں کی صورت میں موجود ہیں، دونوں میں مسلمان آباد ہیں، لیکن ۲۰۰۱ء کے بعد پیدا ہونے والے حالات نے دونوں کے تعلقات میں گہری کشیدگی پیدا کر دی۔ امریکی حملے نے افغانستان اور پاکستان کے درمیان بداعتمادی کی ایک لکیر کھینچ دی، جس نے بعد کے فساد کی بنیاد رکھی۔

امریکہ افغانستان سے رسوا ہو کر رخصت ہوا، مگر اس کی پھیلائی ہوئی نفرت اور عدمِ اعتماد آج بھی خطے میں مختلف شکلوں میں موجود ہے۔ کبھی ہندوستان کے ذریعے، کبھی افغانستان میں موجود پاکستان مخالف عناصر کے ذریعے، اور کبھی پاکستان کے اندر امریکی نواز حکمرانوں یا مخصوص مفاداتی گروہوں کے ذریعے افغانستان سے تعلقات خراب کیے جاتے ہیں۔ یہ دہشت گردی اور اسلامی ممالک کی باہمی لڑائی بعض طاقتوں کے مفادات کے لیے تو مفید ہو سکتی ہے، مگر امتِ مسلمہ کے مفاد میں ہرگز نہیں۔ پڑوس میں لگنے والی آگ دونوں اطراف کو نقصان پہنچاتی ہے۔ امریکہ افغان جنگ میں پاکستان پہلے ہی بہت کچھ کھو چکا ہے۔ اس پورے خطے کے امن کے لیے ضروری ہے کہ معاملات بات چیت سے حل کیے جائیں اور امت کے اتحاد کو مقدم رکھا جائے:

تمیزِ رنگ و بو بر ما حرام است
کہ ما پروردہ ای یک نو بہاریم

(اقبال، فارسی: ص ۲۲۲)

"رنگ اور بو کی تفریق ہم پر حرام ہے، کیوں کہ ہم ایک ہی بہار کے پالے ہوئے ہیں۔"

مسلمانوں کے باہمی جھگڑوں کا خاتمہ اور اتحادِ امت کا قیام آج کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ اگر مسلمان رنگ، نسل، وطن، زبان اور قومیت کی بنیاد پر تقسیم رہیں گے تو طاغوتی طاقتیں انہیں اپنے مفادات کے لیے ایک دوسرے سے لڑاتی رہیں گی۔ اقبال کے نزدیک قومیت پرستی اور وطنیت پرستی اسلام کی روح سے ہم آہنگ نہیں۔ انہوں نے وطن پرستی کو کفن کے مترادف قرار دیا، یعنی جب مسلمان اپنی اصل ملی شناخت کو چھوڑ کر محض علاقائی اور قومی تعصبات میں تقسیم ہو جائیں گے تو ان کی اجتماعی قوت ختم ہو جائے گی۔

اقبال کے نزدیک ہماری اصل پہچان اسلام ہے۔ بحیثیت امت ہم سب ایک ہی بہار کے پروردہ ہیں۔ ہمیں ایرانی، افغانی، عجمی، عربی، ہندوستانی یا کسی اور علاقائی نسبت کی بنیاد پر تفرقے میں نہیں پڑنا چاہیے۔ ہمارا حقیقی رشتہ کلمہ، ایمان اور رسولِ اکرم ﷺ کی امت ہونے کی بنیاد پر قائم ہے۔ یہی رشتہ ہمیں دنیا بھر میں ایک مشترک شناخت عطا کرتا ہے اور باہمی ہمدردی، مدد اور اتحاد کا حکم دیتا ہے۔ علامہ اقبال بھی اسی اتحادِ امت کے خواہاں تھے، اور ان کی پیش گوئیوں، تنبیہات اور فکری اشاروں کا بنیادی مقصد مسلمانوں کو اسی وحدت، بیداری اور خودشناسی کی طرف متوجہ کرنا تھا۔

### ایران اور عالمی طاقتیں

پاکستان کے ہمسایہ ممالک میں ایران ایک نہایت اہم، قدیم تہذیبی ورثے کا حامل اور مضبوط اسلامی ملک ہے۔ ایران کا شمار دنیا کی قدیم ترین تہذیبوں اور بڑی تاریخی قوتوں میں ہوتا ہے۔ ایک زمانہ تھا جب ایک طرف رومی سلطنت کا اقتدار قائم تھا تو دوسری طرف فارس، یعنی ایران، اپنی سیاسی قوت، عسکری طاقت، معاشی استحکام اور تہذیبی عظمت کے باعث دنیا میں

نمایاں حیثیت رکھتا تھا۔ یہ خطہ ہمیشہ اپنی خودداری، غیرت، تہذیبی وقار اور علمی و ادبی عظمت کے حوالے سے پہچانا گیا ہے۔

علامہ اقبال کو ایران سے خصوصی قلبی اور فکری وابستگی تھی۔ ایران علم و ادب، ثقافت، فلسفہ، عرفان اور فنونِ لطیفہ کے اعتبار سے اسلامی دنیا میں ایک ممتاز مقام رکھتا ہے۔ اس قوم نے اپنی تاریخ میں بڑی بڑی عالمی طاقتوں کے سامنے اپنی تہذیبی شناخت، خودی اور غیرت کا ثبوت دیا۔ ایران کی تاریخی عظمت کا ایک اہم پہلو یہ بھی ہے کہ خلافتِ راشدہ کے عہد میں حضرت عمر فاروق کے زمانے میں فارس فتح ہوا، اور یہ فتح اسلامی تاریخ کی ابتدائی عظیم فتوحات میں شمار ہوتی ہے۔

اقبال کے کلام کا بڑا حصہ فارسی زبان میں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اہلِ ایران علامہ اقبال سے گہری محبت رکھتے ہیں۔ انقلابِ ایران کے کئی رہنماؤں نے اقبال کو اپنا فکری رہنما سمجھا اور ان کے افکار سے استفادہ کیا۔ پاکستان اور ایران کے درمیان بھی ایک گہرا دینی، تہذیبی اور تاریخی رشتہ موجود ہے۔ دونوں ملکوں کے عوام کے درمیان رشتے داریاں، ثقافتی قربتیں اور دلی تعلقات پائے جاتے ہیں، خصوصاً سرحدی علاقوں اور بلوچ قبائل میں یہ رشتہ زیادہ نمایاں ہے۔ ایران نے ماضی میں کئی مشکل مواقع پر پاکستان کا ساتھ دیا، اور پاکستان نے بھی ایرانی بھائیوں کو کبھی فراموش نہیں کیا۔

حکومتوں کی تبدیلیوں کے ساتھ پاکستان اور ایران کے تعلقات میں کبھی قربت اور کبھی دوری پیدا ہوتی رہی، لیکن دونوں ممالک کے عوام کے دلوں میں ایک دوسرے کے لیے محبت، ہمدردی اور خیر خواہی موجود رہی۔ ایران شیعہ اکثریت کا ملک ہے، جب کہ پاکستان میں بھی اہلِ تشیع کی ایک بڑی تعداد آباد ہے۔ بین الاقوامی اسلام دشمن قوتوں نے ہر دور میں اس مسلکی تنوع سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی۔ پاکستان میں شیعہ اور سنی مسلمانوں کو باہم لڑانے، مذہبی منافرت پیدا کرنے اور داخلی انتشار کو ہوا دینے کی سازشیں کی گئیں، جن میں بعض

اوقات بیرونی طاقتوں کے ساتھ اندرونی سہولت کار بھی شریک رہے۔ اس انتشار کے نتیجے میں بڑی بڑی دینی شخصیات کو قتل کیا گیا اور معاشرے میں عدمِ اعتماد اور خوف کی فضا پیدا ہوئی۔

یہ حقیقت نظر انداز نہیں کی جاسکتی کہ اگر دین کو صرف مسلکی تعصبات کی بنیاد پر سمجھا اور فروغ دیا جائے تو اس کے نتائج نہایت خطرناک ہو سکتے ہیں۔ اصل سوال یہ ہے کہ جب رب ایک ہے، قرآن ایک ہے، رسول ﷺ ایک ہیں، تو ان کے ماننے والوں کے درمیان اس قدر دوری، نفرت اور عداوت کیوں پیدا ہو؟ امت کو ایک ہی نسبت پر متحد ہونا ہوگا، ورنہ اسلام کے پیروکار خود آپس میں لڑ کر کمزور ہوتے رہیں گے اور دشمنانِ اسلام اپنے مقاصد میں کامیاب ہو جائیں گے۔ بقول علامہ اقبال:

عشق در جان و نسَب در پیکر است
رشتۂ عشق از نسَب مُحکَم تر است

(اقبال، فارسی: ص ۱۶۳)

"عشق روح میں ہوتا ہے، اور نسب جسم میں، عشق کا رشتہ نسب سے زیادہ مضبوط ہوتا ہے۔"

مسلمانوں کی محبت اور عشق کا مرکز رسول اللہ ﷺ کی ذاتِ اقدس ہے، اور ان کی عبادات کا مرکز صرف اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔ اگر امت اسی اصول پر قائم رہے تو اس کا وقار، اتحاد اور اجتماعی قوت برقرار رہ سکتی ہے۔ اقبال نے اگرچہ ایران کے حوالے سے کوئی صریح سیاسی پیش گوئی نہیں کی، تاہم وہ اس خطے کی تہذیبی، دینی اور سیاسی اہمیت سے بخوبی آگاہ تھے۔ ایک طرف ہندوستان اپنی تہذیب اور ثقافت رکھتا ہے، دوسری جانب عرب دنیا کی اپنی روایات اور تاریخ ہے، جب کہ ایران ان دونوں خطوں کے درمیان علم، ادب، تہذیب اور روحانی روایت کا ایک منفرد مرکز ہے۔

برطانوی عہدِ حکومت میں بھی ان خطوں کے مسلمانوں کے درمیان گہرے تعلقات موجود تھے۔ علم و فن، تجارت، زبان، ادب اور دینی نسبتیں انہیں ایک دوسرے سے جوڑتی تھیں۔ ایران ایک خوشحال اور باوقار ملک تھا۔ علامہ اقبال نے اہلِ ایران کو اپنے کلام میں یہ پیغام دیا کہ وہ عرب مسلمان بھائیوں کے ساتھ اپنے تعلقات کو علاقائی تعصب، نسلی برتری اور تہذیبی تفاخر سے بلند ہو کر دینی بنیاد پر مضبوط رکھیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ اگر تم مدتوں ریشم اور نفاست کے عادی رہے ہو تو دین کی نسبت سے ضرورت پڑنے پر عرب کا کھردرا لباس بھی قبول کر لو۔ اس کا مفہوم یہ ہے کہ رسوم و رواج، حسب نسب، تہذیبی تفاخر اور علاقائی امتیازات سے بلند ہو کر امت کی وحدت کو مقدم رکھا جائے۔ اقبال کو شاید یہ خدشہ تھا کہ مستقبل میں ایران اور عرب کے باہمی تعلقات ہمیشہ مستحکم نہ رہ سکیں گے:

مدّتی غلطیدہ ای اندر حریر
خو بہ کرپاسِ درشتی ہم بگیر

(اقبال، فارسی: ص۳۹)

"اگرچہ تو مدتوں ریشم میں لپٹا رہا ہے، اب کھردرے کپڑے کی سختی کو بھی قبول کر۔"

موجودہ عالمی حالات کو فکرِ اقبال کے تناظر میں دیکھا جائے تو یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ ایران اور عرب ممالک کے درمیان کوئی بھی شدید کشیدگی پورے خطے کے لیے تباہ کن ثابت ہو سکتی ہے۔ مغربی طاقتیں، امریکہ اور بالخصوص اسرائیل اس پورے خطے کو مسلسل دباؤ، جنگی فضا اور عدمِ استحکام میں مبتلا رکھنا چاہتے ہیں۔ ایسی جنگوں سے ایک طرف عالمی طاقتوں کو معاشی اور عسکری فائدہ حاصل ہوتا ہے، دوسری طرف اسرائیل اپنے وسیع تر علاقائی عزائم کی تکمیل کے لیے آگے بڑھتا ہے۔

صہیونی فکر میں گریٹر اسرائیل کا تصور ایک اہم سیاسی اور مذہبی خواہش کے طور پر موجود رہا ہے۔ اس منصوبے کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ عرب ممالک، ایران اور پاکستان جیسے اہم اسلامی ممالک ہیں۔ اسی لیے خطے کے متعدد عرب اسلامی ممالک کو جنگوں، داخلی انتشار،

معاشی کمزوری اور سیاسی عدمِ استحکام کا شکار کیا گیا۔ موجودہ حالات میں سعودی عرب، قطر، متحدہ عرب امارات، مصر، ایران اور پاکستان جیسے ممالک خطے کی سیاست میں بنیادی اہمیت رکھتے ہیں۔ مگر عالمی طاقتیں ان ممالک کو اپنے مفادات، معاشی دباؤ، عسکری معاہدوں اور سیاسی حکمت عملیوں کے ذریعے محدود رکھنے کی کوشش کرتی رہتی ہیں۔

ایران اور پاکستان ایسے ممالک ہیں جو اسلامی شناخت، جغرافیائی اہمیت اور دفاعی صلاحیت کے باعث عالمی طاقتوں کی خاص توجہ کا مرکز رہتے ہیں۔ براہِ راست مسلم عوام سے لڑنا ان طاقتوں کے لیے آسان نہیں، کیونکہ مسلمان دین اور وطن کے دفاع میں بڑی قربانی دینے سے گریز نہیں کرتے۔ اسی لیے اکثر یہ حکمت عملی اختیار کی جاتی ہے کہ اندرونی اختلافات کو ہوا دی جائے، حکومتوں کو غیر مستحکم کیا جائے، معاشی دباؤ پیدا کیا جائے اور ایسے عناصر کو آگے لایا جائے جو عالمی طاقتوں کے مفادات کے لیے زیادہ مفید ہوں۔

امریکہ نے مختلف خطوں میں ایسی حکومتوں کو گرانے یا کمزور کرنے کی کوشش کی جہاں اس کے مفادات کے راستے میں مزاحمت موجود تھی۔ مصر، لیبیا اور دیگر عرب ممالک میں سیاسی تبدیلیاں اسی وسیع تر عالمی حکمتِ عملی کے تناظر میں دیکھی جاسکتی ہیں۔ مغربی اور صہیونی طاقتوں کی لڑائیاں بظاہر سیاسی نعروں کے تحت لڑی جاتی ہیں، مگر ان کے پس منظر میں وسائل، تیل، معدنیات، تجارتی راستوں اور عالمی اثر و رسوخ کے مفادات کارفرما ہوتے ہیں۔ جب ایک ملک معاشی اور سیاسی طور پر تباہ ہو جاتا ہے تو اگلا ملک نشانے پر آجاتا ہے۔

اسی تناظر میں حالیہ عالمی واقعات کو دیکھا جائے تو محسوس ہوتا ہے کہ تیل، توانائی، معدنی ذخائر اور تجارتی راستوں پر قبضے کی خواہش آج بھی عالمی سیاست کا بنیادی محرک ہے۔ ایران پر دباؤ اور حملوں کو بھی اسی تناظر میں سمجھا جاسکتا ہے۔ مقصد صرف کسی حکومت کو کمزور کرنا نہیں، بلکہ اس خطے کے تیل، توانائی، عسکری قوت اور سیاسی خودمختاری کو قابو میں رکھنا ہے۔ تاہم ایرانی قوم نے اسرائیل اور امریکہ کے مقابلے میں جس جرات اور استقامت کا مظاہرہ کیا، اس نے دنیا کو حیرت میں مبتلا کر دیا۔ ایران کے بڑے سیاسی و عسکری رہنماؤں کی شہادتوں کے

باوجود اس قوم نے اپنے وطن کے دفاع میں غیر معمولی حوصلہ دکھایا اور یہ ثابت کیا کہ حق پر قائم رہنے والی قومیں بڑی قربانیوں سے بھی پیچھے نہیں ہٹتیں۔

آئین جوانمرداں، حق گوئی و بے باکی
اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی

(اقبال، اردو: ص۳۸۶)

ایسا محسوس ہوتا ہے کہ علامہ اقبال کا یہ شعر موجودہ حالات میں ایرانی قوم کی جرات، حق گوئی اور بے باکی پر بھی صادق آتا ہے۔ سینکڑوں قربانیوں کے باوجود انہوں نے حق کا علم نہیں چھوڑا۔ ایک کے بعد ایک قربانی دیتے ہوئے انہوں نے جنگی اور سیاسی میدان میں مزاحمت جاری رکھی۔ اسلام دشمن طاقتوں کی راہ میں جو چند بڑی قوتیں رکاوٹ ہیں، ان میں ایران ایک اہم حیثیت اختیار کر چکا ہے۔ اسی لیے ممکن ہے کہ عالمی طاقتوں کا اگلا ہدف پاکستان ہو، کیونکہ پاکستان بھی اسلامی شناخت، دفاعی صلاحیت اور جغرافیائی اہمیت کے باعث ان کے لیے نہایت حساس ملک ہے۔

## پاکستان کی اہمیت موجودہ عالمی تناظر میں

پاکستان اسلام کے نام پر قائم ہونے والی وہ ریاست ہے جس نے اپنی دفاعی صلاحیتوں کا لوہا ہر دور میں منوایا۔ قیامِ پاکستان کو اٹھتر (۷۸) سال ہو چکے ہیں۔ اس دوران پاکستان پر کئی جنگیں مسلط کی گئیں، اسے اندرونی طور پر کمزور کرنے کی کوششیں ہوئیں، دہشت گردی، مذہبی منافرت، مسلکی کشیدگی، سیاسی عدمِ استحکام اور معاشی بحرانوں نے اسے بار بار متاثر کیا۔ اس کے باوجود یہ قوم آہستہ آہستہ آگے بڑھتی رہی اور اللہ تعالیٰ نے اسے ایٹمی طاقت بنا دیا۔

پاکستان اسلامی دنیا کی واحد ایٹمی قوت ہے، لیکن افسوس کہ بد دیانت، مفاد پرست اور کرپٹ حکمرانوں کی پالیسیوں نے اس ملک کو معاشی طور پر کمزور کر دیا۔ گزشتہ کئی دہائیوں میں جس طرح قومی وسائل کو لوٹا گیا، قرضوں کا بوجھ بڑھایا گیا اور ملکی خزانے کو ذاتی مفادات کے لیے

استعمال کیا گیا، اس نے معیشت کو شدید نقصان پہنچایا۔ آج پاکستان پر کھربوں روپے کے قرضے ہیں، مگر ان قرضوں کا فائدہ عام عوام تک نہیں پہنچا۔ بد دیانت حکمرانوں اور مفاد پرست طبقوں نے اپنی تجوریاں بھریں، بیرونِ ملک جائیدادیں بنائیں اور عوام کو غربت، مہنگائی، بے روزگاری اور محرومی کے حوالے کر دیا۔

یہ طبقہ عوام کی حقیقی پسند کبھی نہیں رہا، لیکن ہر دور میں تعلیم، روزگار، ترقی اور خوشحالی کے نعروں کے ذریعے غریب اور ناخواندہ عوام کو دھوکا دیا گیا۔ آج پاکستان معاشی طور پر اس قدر کمزور ہو چکا ہے کہ اس کی دفاعی ٹیکنالوجی اور اسٹریٹجک اثاثوں پر دشمن نظریں جمائے بیٹھا ہے۔ جہاں حکمرانوں کی بددیانتی ایک بڑا مسئلہ ہے، وہاں قوم کے اخلاقی مزاج میں بھی کمزوری پیدا ہو چکی ہے۔ معاشرے میں جہاں موقع ملتا ہے، لوگ اپنی استطاعت کے مطابق بدعنوانی میں حصہ ڈال لیتے ہیں۔ اسلام کے نام پر قائم ریاست کو اسلامی اصولوں پر ڈھالنے کے لیے اگر فوری اور ترجیحی بنیادوں پر کام نہ کیا گیا تو مفاد پرست حکمران خدانخواستہ ملکی دفاعی اثاثوں کا بھی سودا کر سکتے ہیں۔

پاکستانی عوام عموماً اس انتظار میں رہتے ہیں کہ کوئی آئے گا اور ان کے مسائل حل کر دے گا۔ مگر قوموں کی تقدیر اس طرح نہیں بدلا کرتی۔ سالہا سال کی بدانتظامی، بددیانتی اور اخلاقی زوال خود بخود ختم نہیں ہو سکتا۔ اس کے لیے قوم کو خود اپنی حالت بدلنی ہو گی:

اپنی غفلت کی یہی حالت اگر قائم رہی
آئیں گے غسال کابل سے، کفن جاپان سے

(اقبال، اردو: ص ۳۱۷)

ایک طرف پاکستان نے جدید ٹیکنالوجی، دفاعی ساز و سامان اور ایٹمی صلاحیت کے میدان میں ترقی کی، لیکن دوسری طرف ان کامیابیوں کو برقرار رکھنے اور آگے بڑھانے کے لیے معیشت کمزور ہے، خزانے خالی ہیں اور ملک قرضوں پر چل رہا ہے۔ علامہ اقبال نے جس عظیم اسلامی ریاست کا خواب دیکھا تھا، اسے اسلام کی تجربہ گاہ بننا تھا۔ اس ریاست میں اعلیٰ اخلاق، دیانت داری، عدل و انصاف، مساوات اور اسلامی اصول بنیادی حیثیت رکھتے تھے۔ ملک تو بن

گیا، مگر حالات یہاں تک پہنچ گئے کہ نہ اخلاقی اقدار مضبوط رہیں، نہ خوشحالی آئی، نہ عدل و انصاف قائم ہوا، اور نہ اسلامی اصولوں پر مبنی مؤثر نظام تشکیل پا سکا۔ یہ صورتِ حال اچانک پیدا نہیں ہوئی؛ اس تک پہنچنے میں سات دہائیاں لگیں۔

موجودہ عالمی نظام میں وہی ممالک مستحکم رہ سکیں گے جن کی معیشت مضبوط ہو گی، دفاع مضبوط ہو گا اور قوم اپنے اوپر آنے والی مشکلات کا اجتماعی طور پر مقابلہ کرنے کی صلاحیت رکھتی ہو گی۔ بحیثیت قوم اب سنجیدگی سے سوچنا ہو گا کہ اللہ تعالیٰ سے کیے گئے اس وعدے کو پورا کیا جائے جس کی بنیاد پر یہ ملک حاصل کیا گیا تھا۔ پاکستان کو اسلام کی حقیقی تجربہ گاہ کے طور پر دنیا کے سامنے پیش کرنا ہو گا تاکہ یہ ثابت کیا جا سکے کہ اسلام اور اسلامی اصول ہی دنیا میں امن، عدل اور خوشحالی قائم کرنے کا بہترین راستہ ہیں۔

قومیں جب یہ فیصلہ کر لیتی ہیں کہ انہوں نے اپنے معاشرے کو بدلنا ہے تو ایک نہ ایک دن وہ ضرور کامیاب ہو جاتی ہیں۔ جب تک ملک میں ایسے حکمران نہیں آئیں گے جو ایماندار، دیانت دار، عادل اور عوام کے خیر خواہ ہوں، قومیں غلامی، بدحالی اور بے بسی کی زندگی گزارتی رہیں گی۔ پاکستان کو اللہ تعالیٰ نے ہر طرح کی نعمت سے نوازا ہے۔ زرخیز زمین، وسیع صحرا، خزانوں سے بھرے پہاڑ، خوبصورت وادیاں، قیمتی معدنیات، سمندری راستے اور بے شمار ذخائر اس سرزمین میں موجود ہیں۔ اس کے باوجود عوام کی بڑی تعداد غربت، بے روزگاری، تعلیمی محرومی اور صحت کی سہولتوں کے فقدان کا شکار ہے۔ لاکھوں بچے سکول نہیں جا سکتے، دیہی اور شہری علاقوں میں بنیادی سہولتیں ناکافی ہیں، اور عام پاکستانی اپنی خستہ حالی کو مقدر سمجھ کر خاموش ہو جاتا ہے۔

اقبال کے نزدیک انسان تقدیر کا غلام نہیں، بلکہ تقدیر ساز ہے۔ وہ انسان کو عمل، خودی، جدوجہد اور بیداری کا پیغام دیتے ہیں:

عبث ہے شکوہ تقدیر یزداں
تو خود تقدیر یزداں کیوں نہیں ہے

(اقبال، اردو: ص ۳۴۷)

جغرافیائی اعتبار سے پاکستان دنیا کے نہایت اہم خطے میں واقع ہے۔ یہ نہ صرف جنوبی ایشیا بلکہ وسطی ایشیا، مشرقِ وسطیٰ، چین، روس اور یورپ کے لیے بھی غیر معمولی اہمیت رکھتا ہے۔ دنیا میں تجارت، توانائی اور معیشت کے بدلتے ہوئے رجحانات کے باعث ترقی یافتہ ممالک کمزور ممالک پر اپنا اثر و رسوخ قائم کر کے مفادات حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ ایسے حالات میں پاکستان، چین، روس اور وسطی ایشیائی ممالک کے لیے ایک اہم رابطہ گاہ بنتا جارہا ہے۔

چین اپنا تجارتی سامان پاکستان کے راستے دنیا بھر میں پہنچانا چاہتا ہے۔ اسی مقصد کے لیے پاک چین اقتصادی راہداری (CPEC) کا آغاز ۲۰۱۳ میں کیا گیا۔ یہ ۲۷۰۰ کلو میٹر طویل منصوبہ پاکستان اور چین کو عالمی تجارت سے جوڑنے، خطے کی معیشت کو ترقی دینے اور آسان رسائی فراہم کرنے کا عظیم منصوبہ ہے۔ اگر اسے صحیح معنوں میں قومی ترقی کے لیے استعمال کیا جائے تو یہ پاکستان کی تقدیر بدل سکتا ہے۔

گوادر پورٹ دنیا کی اہم ترین بندرگاہوں میں شمار کی جا سکتی ہے۔ یورپ، روس اور وسطی ایشیا کے کئی ممالک کو گرم سمندروں تک رسائی کی ضرورت ہے، کیونکہ ان کے اپنے سمندری راستے سال کے بڑے حصے میں برف اور موسمی مشکلات سے متاثر رہتے ہیں۔ گوادر اور پاکستان کے زمینی راستے ان ممالک کو تجارت، توانائی اور نقل و حمل کے نئے امکانات فراہم کر سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ پاکستان کے شمالی علاقوں اور بلوچستان میں گیس، تانبا، قیمتی پتھر اور معدنی ذخائر بڑی مقدار میں موجود ہیں، جو ملکی معیشت کو مضبوط بنانے کے لیے کافی ہو سکتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے اس وطن کو ہر وہ نعمت عطا کی ہے جس کا تصور کیا جا سکتا ہے۔ مگر پاکستانی قوم نے اللہ سے کیے گئے وعدے کو بھلا دیا، اسلامی اصولوں کو پسِ پشت ڈال دیا اور مغرب کی اندھی تقلید اختیار کر لی۔ نتیجتاً بددیانت، ظالم اور کرپٹ حکمران قوم پر مسلط ہو گئے۔ سوال یہ ہے کہ اتنے وسائل اور ذخائر کے باوجود پاکستان بیرونی قرضوں میں کیوں ڈوبا ہوا ہے؟ اس کا بنیادی سبب بددیانت نظامِ حکومت، کرپٹ حکمران، قانون کی کمزوری اور ادارہ جاتی بدعنوانی

ہے۔ یہاں جس کی لاٹھی اس کی بھینس کا نظام قائم ہے۔ کسی بھی ادارے کا جائزہ لیا جائے تو بدعنوانی، افسر شاہی، نااہلی اور مفاد پرستی سامنے آتی ہے۔

ان تمام حالات کے باوجود پاکستان کی عالمی اہمیت اپنی جگہ قائم ہے۔ امریکہ اگر چین یا افغانستان کے ساتھ مؤثر تعلقات رکھنا چاہتا ہے تو اسے پاکستان کی جغرافیائی حیثیت کو نظر انداز نہیں کر سکتا۔ اسی طرح ایران کے معاملے میں بھی اگر کوئی ملک اہم کردار ادا کر سکتا ہے تو پاکستان بہترین انتخاب ہو سکتا ہے۔ بین الاقوامی منظرنامے میں پاکستان اس خطے کی ایک طاقتور آواز ہے۔ اگر اس اہمیت کا درست انداز میں فائدہ اٹھایا جائے تو چند ہی برسوں میں پاکستان معاشی طور پر مضبوط اور مستحکم بن سکتا ہے۔

غیر اسلامی طاقتیں کبھی نہیں چاہتیں کہ پاکستان اپنی مکمل صلاحیت کے ساتھ ابھرے۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں وقفے وقفے سے خانہ جنگی، دہشت گردی، سیاسی عدمِ استحکام اور مذہبی انتشار کو ہوا دی جاتی ہے۔ ملک دشمن عناصر غیر منظم حکمرانی، کمزور اداروں اور داخلی تنازعات سے فائدہ اٹھا کر وار کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ پاکستان کی تباہی کا ایک اہم سبب حکمرانوں اور اداروں کے درمیان مسلسل کشمکش بھی ہے، جو گزشتہ سات دہائیوں سے جاری ہے۔

اگر پاکستان کو حقیقی معنوں میں ترقی دینی ہے تو پوری قوم کو متحد ہونا ہوگا۔ اس ملک کے قیام کے مقاصد کو دوبارہ سامنے لانا ہوگا، دیانت دار اور عادل حکمران پیدا کرنے ہوں گے، اداروں کو اپنی آئینی حدود میں رہنا ہوگا، اور قومی مفاد کو ذاتی مفادات پر ترجیح دینی ہوگی۔ جب یہ سب عملی صورت اختیار کرے گا تو پاکستان کی وہ اہمیت، جس سے آج بیرونی طاقتیں فائدہ اٹھا رہی ہیں، خود پاکستان کی ترقی، خوشحالی اور عزت کا ذریعہ بنے گی۔ قومی تشخص بحال ہوگا اور دنیا بھر میں پاکستان کو عزت کی نگاہ سے دیکھا جائے گا۔

اگر جواں ہوں مری قوم کے جسور و غیور
قلندری مری کچھ کم سکندری سے نہیں
سبب کچھ اور ہے تو جس کو خود سمجھتا ہے
زوال بندہ مومن کا بے زری سے نہیں

(اقبال، اردو: ص ۵۳۲)

پاکستانی قوم کو اب سنجیدگی سے وہ اسباب تلاش کرنے ہوں گے جو اس کے زوال کا باعث بنے۔ علامہ اقبال نے ہمیشہ نوجوانوں سے بڑی امیدیں وابستہ کیں۔ وہ سمجھتے تھے کہ جب نوجوانوں کی خودی بیدار ہو جاتی ہے تو وہ آسمانوں میں بھی اپنی منزل تلاش کر لیتے ہیں۔ اگر قوم میں عزم، یقین، عمل اور خودشناسی پیدا ہو جائے تو ناممکن بھی ممکن بن سکتا ہے۔ پاکستان اور عالمِ اسلام کی تقدیر بدلنے کی صلاحیت اسی قوم میں موجود ہے۔ ضرورت صرف اس چنگاری کو شعلہ بنانے کی ہے جو ایک دن ضرور روشن ہو گی۔

### اہلِ عرب عالمی تناظر میں

سرزمینِ عرب کو اللہ تعالیٰ نے ہر دور میں ایک خاص عظمت، مرکزیت اور روحانی مقام عطا کیا ہے۔ یہی وہ خطہ ہے جہاں اللہ تعالیٰ نے متعدد انبیائے کرام کو انسانیت کی ہدایت کے لیے مبعوث فرمایا، اور بالآخر اسی سرزمین کو خاتم النبیین حضرت محمد ﷺ کی ولادت، بعثت اور دعوت کا مرکز بنایا۔ اہلِ عرب تاریخی طور پر مختلف قبائل کی صورت میں آباد رہے۔ وہ سخت جان، بہادر، جری اور اپنی روایات کے پابند لوگ تھے، لیکن اسلام سے قبل ان کا معاشرہ قبائلی عصبیت، طاقت کے قانون، باہمی دشمنیوں اور طبقاتی ناانصافیوں کا شکار تھا۔

اسلام سے پہلے عرب معاشرے میں بڑے قبیلے چھوٹے قبیلوں پر غلبہ رکھتے تھے۔ غریب، کمزور اور بے سہارا افراد اکثر طاقتوروں کے رحم و کرم پر ہوتے۔ عدل و انصاف کا کوئی آفاقی یا الہامی نظام موجود نہ تھا؛ قبیلے کے سردار جو قانون مقرر کرتے، وہی لازم سمجھا جاتا۔ قبائلی رسوم و رواج کی پابندی اس شدت سے کی جاتی تھی کہ کوئی شخص انہیں توڑنے کی جرأت نہیں کرتا تھا۔ جاہلیت کا یہ عالم تھا کہ معمولی باتوں پر قبائل کے درمیان جنگ چھڑ جاتی اور نسل در نسل جاری رہتی۔ کبھی پانی پلانے کے حق پر، کبھی گھوڑوں کی دوڑ یا کسی کھیل تماشے میں لگائی گئی شرط پر، اور کبھی محض سرداری کے غرور پر جنگیں شروع ہو جاتیں۔ ان لڑائیوں میں خاندانوں کے خاندان برباد ہو جاتے، مگر انتقام اور عصبیت کا سلسلہ ختم نہ ہوتا۔

اسی تاریک ماحول میں اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوب نبی حضرت محمد ﷺ کو مکہ مکرمہ میں پیدا فرمایا۔ آپ ﷺ کو جوانی میں نبوت عطا ہوئی اور قیامت تک پوری انسانیت کی رہنمائی کے لیے آخری نبی بنا کر بھیجا گیا۔ آپ ﷺ نے اپنی قوم کو اللہ تعالیٰ کی وحدانیت، رسالت کی اطاعت، عدل، مساوات، اخوت اور تقویٰ کی طرف دعوت دی۔ جو لوگ آپ ﷺ پر ایمان لائے، وہ مسلمان کہلائے۔ انہیں زندگی گزارنے کے لیے ایک مکمل نظامِ حیات عطا کیا گیا، جو قرآن مجید کی صورت میں آج بھی انسانیت کے لیے ہدایت کا سرچشمہ ہے۔

قرآن مجید عربی زبان میں نازل ہوا۔ اس اعتبار سے اہلِ عرب کو ایک عظیم سعادت نصیب ہوئی کہ آخری نبی ﷺ انہی میں سے مبعوث ہوئے اور آخری الہامی کتاب بھی انہی کی زبان میں نازل ہوئی۔ بظاہر یہ ایک بڑی فضیلت محسوس ہوتی ہے، مگر اسلام نے اس فضیلت کو نسلی برتری یا قومی تفاخر کی بنیاد نہیں بننے دیا۔ رسول اللہ ﷺ نے حجۃ الوداع کے موقع پر انسانی مساوات کا وہ عظیم اصول بیان فرمایا جو قیامت تک انسانیت کے لیے منشورِ عدل کی حیثیت رکھتا ہے:

نبی پاک ﷺ نے حجۃ الوداع کے موقع پر فرمایا: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ انسانوں، ہم نے تم سب کو ایک ہی مرد و عورت سے پیدا کیا ہے اور تمہیں جماعتوں اور قبیلوں میں بانٹ دیا تا کہ الگ الگ پہچانے جا سکو۔ تم میں زیادہ عزت و کرامت والا خدا کی نظر میں وہی ہے جو خدا سے زیادہ ڈرنے والا ہے۔ کسی عربی کو عجمی پر، کسی عجمی کو عربی پر، کسی کالے کو گورے پر اور کسی گورے کو کالے پر کوئی فوقیت حاصل نہیں ہے۔ برتری صرف تقویٰ کی بنیاد پر ہے۔ (الحق، ص٦)

یہ وہ پیغام تھا جس نے انسانی تاریخ میں عظمتِ آدم، احترامِ انسانیت اور مساوات کا ایک نیا باب کھولا۔ اس اعلان نے عرب و عجم، رنگ و نسل، قبیلہ و قوم، طاقت و کمزوری اور امارت و غربت کی مصنوعی دیواروں کو گرا دیا۔ اسلام نے انسان کو صرف تقویٰ، کردار اور اطاعتِ الٰہی کی بنیاد پر عزت عطا کی۔ اسی پیغام کی برکت سے مسلمانوں نے دنیا میں غیر معمولی مقام حاصل کیا۔ جب تک مسلمان اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَ الرَّسُوْلَ کے اصول پر قائم رہے، اللہ تعالیٰ کی رحمت ان پر سایہ فگن رہی اور وہ دنیا میں عزت، قوت اور قیادت کے حامل رہے۔

کی محمد ﷺ سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں
یہ جہاں چیز ہے کیا ،لوح و قلم تیرے ہیں

(اقبال، اردو: ص۲۳۷)

اللہ تعالیٰ نے امتِ محمدیہ ﷺ کو خیرِ امت قرار دیا، جسے انسانوں کی بھلائی، عدل کے قیام، نیکی کے فروغ اور برائی سے روکنے کی ذمہ داری سونپی گئی۔ تاریخِ اسلام میں ایسے عظیم حکمران، مصلحین اور سپہ سالار گزرے جنہوں نے کفر، ظلم اور جبر کے خلاف جہاد کیا، اسلامی معاشرے قائم کیے، عدل و انصاف کو فروغ دیا اور عرب، عجم، افریقہ اور یورپ تک اسلام کا پیغام پہنچایا۔ لیکن سوال یہ ہے کہ وہی اہلِ عرب، جنہیں اللہ تعالیٰ نے دینی مرکزیت اور روحانی عظمت عطا کی تھی، رفتہ رفتہ اپنے اسلاف کی تعلیمات سے کیوں دور ہو گئے؟ وہ مغربی تہذیب کے ظاہری حسن، مادیت، قومیت اور سیاسی مفادات کے اسیر کیوں بن گئے؟

خلافتِ عثمانیہ کے خاتمے کے بعد اہلِ عرب نے غیر اسلامی عالمی طاقتوں کے تعاون سے علیحدہ علیحدہ ریاستوں کے قیام کی راہ اختیار کی۔ بظاہر یہ قومی آزادی کا مرحلہ تھا، مگر حقیقت میں بہت سی عرب ریاستیں عثمانی نظام سے نکل کر برطانوی، فرانسیسی اور مغربی اثرات کے دائرے میں چلی گئیں۔ اقبال نے اسی زوال کو نہایت درد کے ساتھ بیان کیا:

گنوا دی ہم نے جو اسلاف سے میراث پائی تھی
ثریا سے زمیں پر آسماں نے ہم کو دے مارا

(اقبال، اردو: ص۲۰۷)

## عرب ممالک کی قومیت پر تقسیم

خلافتِ عثمانیہ کے خاتمے کے بعد عرب قوم ایک بار پھر قومیت، وطنیت اور علاقائی مفادات کی بنیاد پر تقسیم ہونے لگی۔ برطانیہ اور فرانس کے زیرِ اثر اس خطے میں مختلف ادوار میں بائیس اسلامی ریاستیں قائم ہوئیں۔ ہر ریاست نے اپنی جداگانہ قومی شناخت، سیاسی نظام اور

حکومتی ڈھانچہ اختیار کیا۔ اس تقسیم نے امت کے اجتماعی تصور کو کمزور کیا اور عرب دنیا کو چھوٹی چھوٹی سیاسی وحدتوں میں بانٹ دیا۔

سعودی عرب کی مثال لی جائے تو ۱۹۳۲ء میں عبدالعزیز ابن سعود نے مختلف قبائل کو متحد کر کے سعودی عرب کی بنیاد رکھی۔ ابتدائی دور میں اس ریاست کی معاشی حالت مضبوط نہ تھی، مگر تیل اور گیس کی دریافت نے حالات بدل دیے۔ سعودی عرب جلد ہی اپنے خطے میں ایک بڑی معاشی قوت کے طور پر ابھرا۔ تیل کی صنعت، ریفائنریوں، جدید تعمیرات، عالمی تجارت اور توانائی کی برآمدات نے اسے دنیا کے اہم ترین ممالک میں شامل کر دیا۔ یورپ، امریکہ اور ایشیائی ممالک کی توانائی کی ضروریات پوری کرنے کے لیے وسیع نظام قائم کیا گیا۔

پاکستان اور سعودی عرب کے تعلقات ہمیشہ دینی، جذباتی اور اسٹریٹجک اہمیت کے حامل رہے ہیں۔ پاکستان پر جب بھی کوئی مشکل وقت آیا، سعودی عرب نے مالی اور سیاسی تعاون فراہم کیا۔ پاکستان نے بھی سعودی عرب کو اسلامی بھائی سمجھ کر ہر ممکن تعاون دیا۔ پاکستان اس خطے کی واحد بڑی اسلامی دفاعی قوت ہے؛ اس لیے جب بھی حرمین شریفین کی حفاظت کا معاملہ سامنے آیا، پاکستانی قوم نے حرم کی پاسبانی کو اپنی جانوں سے بڑھ کر عزیز سمجھا۔

برطانیہ اور فرانس سے آزادی حاصل کرنے والی دیگر عرب ریاستوں نے بھی معاشی ترقی کی۔ انہوں نے جدید طرزِ تعمیر، بڑی عمارتوں، تجارتی مراکز، سیاحت، سرمایہ کاری اور عالمی کاروبار کو فروغ دیا۔ گزشتہ چند دہائیوں میں اہلِ عرب پوری دنیا کی توجہ کا مرکز بنے رہے۔ خاص طور پر متحدہ عرب امارات نے تجارت، سرمایہ کاری، سیاحت اور پر آسائش زندگی کے ذریعے مشرق و مغرب کو اپنی طرف متوجہ کیا۔ دنیا کے بڑے سرمایہ داروں نے عرب امارات میں سرمایہ لگایا، کیونکہ اسے تجارت، رہائش، سرمایہ کاری اور تحفظ کے اعتبار سے ایک معیاری مرکز بنایا گیا۔

تاہم مادی ترقی اور فنِ تعمیر کی اس دوڑ میں اہلِ عرب یہ بھولتے گئے کہ جن مغربی طاقتوں کو وہ سرمایہ کاری، تجارت اور ترقی کے نام پر اپنے خطے میں لا رہے ہیں، وہ وقت آنے پر ان کے لیے کتنا بڑا خطرہ بن سکتی ہیں۔ سعودی عرب، مصر اور چند دیگر ریاستوں کے علاوہ بہت کم

عرب ممالک نے سنجیدگی سے یہ سوچا کہ عالمی سیاست میں طاقت کا توازن کسی بھی وقت بدل سکتا ہے۔ انہیں یہ بھی سمجھنا چاہیے تھا کہ ان کے خطے میں ایک ایسی قوم آباد کی جارہی ہے جس نے تاریخی طور پر زمین میں فساد پھیلایا اور جس سے متعلق قرآن نے مسلمانوں کو محتاط رہنے کی تعلیم دی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو ہمیشہ دفاعی تیاری کا حکم دیا ہے:

وَ اَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّ مِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَ عَدُوَّكُمْ وَ اٰخَرِيْنَ مِنْ دُوْنِهِمْ لَا تَعْلَمُوْنَهُمْ اَللّٰهُ يَعْلَمُهُمْ ؕ وَ مَا تُنْفِقُوْا مِنْ شَيْءٍ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ يُوَفَّ اِلَيْكُمْ وَ اَنْتُمْ لَا تُظْلَمُوْنَ۔ (القرآن،۸: ۶۰)

"تم ان کے مقابلے کے لیے اپنی طاقت بھر قوت کی تیاری کرو اور گھوڑوں کے تیار رکھنے کی کہ اس سے تم اللہ کے دشمنوں کو خوف زدہ رکھ سکو اور ان کے سوا اوروں کو بھی، جنھیں تم نہیں جانتے اللہ انھیں خوب جان رہا ہے جو کچھ بھی اللہ کی راہ میں صرف کروگے وہ تمھیں پورا پورا دیا جائے گا اور تمہارا حق نہ مارا جائے گا۔"

عرب ممالک مادی ترقی اور جدیدیت میں اس قدر مصروف ہوگئے کہ شاید انہوں نے اس قرآنی حکم کو پسِ پشت ڈال دیا۔ یہودیوں کا عرب سرزمین میں آنا اور وہاں آباد ہونا محض اتفاق نہ تھا، بلکہ ایک طویل تاریخی اور سیاسی منصوبے کا حصہ تھا۔ اگر یہ غلطی ہو ہی گئی تھی تو اہلِ عرب کو اپنی آنکھیں اور کان کھلے رکھنے چاہییں تھے۔ لیکن غفلت، باہمی اختلافات، قومیت پرستی اور عسکری کمزوری نے انہیں ایسی صورتِ حال سے دوچار کیا جس کے نتائج آج بھی پورا خطہ بھگت رہا ہے۔

مال و دولت کے انبار ہونے کے باوجود عرب کی بائیس ریاستوں میں چند ایک کے سوا کسی کے پاس ایسی عسکری قوت نہیں جو جدید دشمن کا بھرپور مقابلہ کرسکے۔ حتیٰ کہ سعودی عرب جیسے اہم ملک کو بھی اپنے دفاع کے لیے امریکہ پر انحصار کرنا پڑتا ہے۔ اگرچہ مقدس مقامات کی حفاظت کے لیے پاک فوج اور پاکستانی قوم ہمیشہ تیار رہی ہے، اور مکہ و مدینہ ہر مسلمان کے لیے

اپنی جان سے بڑھ کر عزیز ہیں، لیکن عرب ممالک کے لیے ضروری تھا کہ وہ اپنی دفاعی قوت کو مادی ترقی کے ساتھ ساتھ مضبوط بناتے۔

بلند و بالا عمارتیں، پر آسائش شہر، تجارتی مراکز اور جدید سہولتیں ضرور اہم ہیں، مگر قومی بقا کے لیے دفاعی تیاری ان سب سے پہلے آتی ہے۔ سعودی عرب، قطر، بحرین، مصر، اردن اور دیگر ممالک کے پاس جنگی ساز و سامان موجود ہے، لیکن جدید دور کی جنگوں کے تقاضوں کے سامنے یہ تیاری کافی نہیں۔ گزشتہ چند دہائیوں میں عرب دنیا نے اس کمی کا خمیازہ بار بار بھگتا ہے۔

قرآن مجید کے مطابق یہود و نصاریٰ مسلمانوں کے حقیقی دوست نہیں ہو سکتے۔ اہلِ یورپ نے یہودیوں کو یورپ سے نکال کر انبیائے کرام کی سرزمین میں آباد کیا؛ یہ کوئی سادہ تاریخی واقعہ نہیں تھا، بلکہ ایک سوچی سمجھی عالمی سازش تھی جس کی حقیقت مسلمانوں کو بہت دیر سے سمجھ آ رہی ہے۔ اللہ کے حکم سے غفلت کی سزا امت کو مختلف صورتوں میں مل رہی ہے۔ اہلِ عرب نے جس زبان میں قرآن نازل ہوا، اسی زبان کے الہامی احکام کو عملی زندگی سے دور کر دیا۔ نتیجہ یہ ہے کہ شان و شوکت، مال و دولت اور جدید عمارتوں کے باوجود چند ہزار یہودی کروڑوں عرب مسلمانوں پر بھاری دکھائی دیتے ہیں۔

قومیت کا بت اہلِ عرب پر اس قدر غالب آیا کہ انہوں نے افریقی، ایشیائی اور عجمی مسلمانوں کو اپنے سے دور کر لیا۔ اتحادِ امت تو دور رہا، مسلمان ایک دوسرے کو مکمل طور پر اپنا سمجھنے سے بھی محروم ہوتے گئے۔ علامہ اقبال امت کی تقدیر کے اس اصول کو یوں بیان کرتے ہیں:

میں تجھ کو بتاتا ہوں تقدیر امم کیا ہے
شمشیر و سناں اول، طاؤس و رباب آخر

(اقبال، اردو: ص ۳۸۲)

اقبال اس شعر میں امتِ مسلمہ کو واضح پیغام دیتے ہیں کہ اگر تم دنیا میں عزت، آبرو اور خود مختاری کے ساتھ زندہ رہنا چاہتے ہو تو سب سے پہلے اپنے دفاع کا سامان تیار کرو۔ طاقت، تنظیم، جہاد، غیرت اور خودی کے بغیر قومیں زندہ نہیں رہ سکتیں۔ عیش و عشرت، موسیقی،

راحت، آسائش اور ظاہری حسن بعد کی چیزیں ہیں۔ اگر قومیں پہلے عیش و عشرت کو اختیار کریں اور دفاع، علم، کردار اور جدوجہد کو بھول جائیں تو وہ زوال کا شکار ہو جاتی ہیں۔

آج امتِ مسلمہ فرقوں، قومیتوں، مسلکوں اور علاقائی شناختوں میں تقسیم ہے، اور اس تقسیم کا سب سے زیادہ فائدہ اسلام دشمن قوتوں کو پہنچ رہا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے عربی و عجمی، گورے و کالے اور قبیلے و نسل کے تفرقے سے منع فرمایا تھا، مگر آج امت اسی تقسیم کا شکار ہے۔ ایک فرقہ دوسرے کو کافر کہتا ہے، ایک قوم دوسری قوم سے خود کو برتر سمجھتی ہے، اور دشمن سب کو صرف اس لیے نشانہ بناتا ہے کہ وہ مسلمان ہیں۔

فرقہ بندی ہے کہیں اور کہیں ذاتیں ہیں
کیا زمانے میں پنپنے کی یہی باتیں ہیں

(اقبال، اردو: ص ۲۳۰)

آج امت پر ایسا وقت آ چکا ہے کہ دنیا بھر میں مسلمان کمزور، منتشر اور بے بس دکھائی دیتے ہیں۔ کہیں بھی دہشت گردی کا کوئی واقعہ پیش آ جائے، الزام مسلمانوں پر لگا دیا جاتا ہے، اور پھر اسلامی ملکوں پر فوجیں چڑھا دی جاتی ہیں۔ کوئی عالمی ادارہ ان طاقتوں کو روکنے کے لیے مؤثر کردار ادا نہیں کرتا۔ اقوام متحدہ، جس کی بنیادی ذمہ داری دنیا میں امن، انصاف اور انسانوں کے تحفظ کو یقینی بنانا ہے، مسلمانوں کی تباہی کا تماشا دیکھتی رہتی ہے۔ کروڑوں کی تعداد میں ہونے کے باوجود مسلمان اپنے اوپر ہونے والے ظلم و جبر کو مؤثر انداز میں دنیا کے سامنے پیش نہیں کر پاتے۔

اقبال نے امت کی اس حالت کو گویا ایک صدی پہلے دیکھ لیا تھا۔ وہ جانتے تھے کہ ملت کی عزت اس کی جمعیت، اتحاد اور نظم سے وابستہ ہے:

آبرو باقی تری ملت کی جمعیت سے تھی
جب یہ جمعیت گئی ، دنیا میں رسوا تو ہوا

(اقبال، اردو: ص ۲۱۷)

اب وقت آ چکا ہے کہ اتحادِ امت کو محض نعرہ نہ رہنے دیا جائے، بلکہ اسے عملی قومی، سیاسی، معاشی اور عسکری حکمتِ عملی بنایا جائے۔ فرقہ وارانہ رویوں، مسلکی تعصبات، قومیت پرستی اور علاقائی برتری کے احساس کو ترک کر کے ایک ملت بننا ہو گا۔ جب تک مسلمان ایک نظام، ایک مقصد اور ایک دینی شعور کے تحت متحد رہے، کسی دشمن کو ان کا سامنا کرنے کی جرأت نہ ہوئی۔ اسلام پھیلتا رہا، غیر مسلم قومیں اسلامی اصولوں، عدل و انصاف، اخوت اور مساوات سے متاثر ہو کر اسلام قبول کرتی رہیں، اور مسلمانوں کا رعب و دبدبہ دنیا میں قائم رہا۔

امت کا آخری بڑا سیاسی اتحاد خلافتِ عثمانیہ کے خاتمے کے ساتھ ٹوٹ گیا۔ عرب کئی ریاستوں میں تقسیم ہو گئے، ہر ریاست کا اپنا نظام، اپنا قانون اور اپنا مفاد بن گیا۔ امت جو اہلِ عرب سے خاص دینی وابستگی رکھتی تھی، جب اس نے دیکھا کہ اہلِ عرب بھی قومیت، وطنیت اور مادی آسائشوں کے پیچھے چل پڑے ہیں، تو پوری امت کی حالت کمزور ہوتی گئی۔ رسوائی اور انتشار مسلمانوں کا مقدر بن گئے۔

آج بھی ایک ہی راستہ ہے جو پوری امت کو دوبارہ متحد کر سکتا ہے، اور وہ قرآن و سنت کی طرف واپسی ہے۔ اگر اسلامی ممالک اپنی حکومتوں، معاشرت، تعلیم، معیشت، قانون اور دفاع کو قرآن و سنت کی بنیاد پر منظم کریں تو امتِ مسلمہ دوبارہ اپنی سمت بدل سکتی ہے۔ یہ کام اہلِ عرب کے لیے نسبتاً زیادہ آسان ہے، کیونکہ وہ اہلِ حرم بھی ہیں اور اہلِ زبان بھی۔ قرآن ان کی زبان میں نازل ہوا، حرمین شریفین ان کے خطے میں ہیں، اور امت کا روحانی مرکز بھی ان ہی کی سرزمین پر واقع ہے۔ علامہ اقبال اہلِ عرب کی اس ذمہ داری کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

> عالم اسلام کی اصلاح اور عجمی فتنوں کے ازالے کی کوئی صورت ہے تو یہ کہ عرب از سر نو زندہ ہوں۔ عرب سنبھل گئے تو اسلام کی حقیقی روح بھی جو طرح طرح کے اثرات سے دب رہی ہے پھر سے بیدار ہو جائے گی۔
> (نیازی، ص ۴۴)

## اسرائیل کا قیام اور عربوں کی غفلت

یہودیوں کی تاریخ ہزاروں سال پر محیط ہے۔ اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو مختلف نعمتوں سے نوازا اور ایک زمانے تک انہیں دنیا میں خاص فضیلت عطا فرمائی۔ متعدد انبیائے کرام علیہم السلام کا تعلق اسی قوم سے تھا۔ حضرت یوسف سے لے کر حضرت عیسیٰ تک کئی انبیاء اور پیغمبر بنی اسرائیل میں مبعوث ہوئے۔ چار آسمانی کتابوں میں سے تین کتابیں انبیائے بنی اسرائیل پر نازل ہوئیں۔ قرآن مجید میں بھی بنی اسرائیل پر ہونے والی نعمتوں، من و سلویٰ کے نزول، اور ان کی دینی و تاریخی حیثیت کا ذکر ملتا ہے۔

تاہم قرآن مجید یہ بھی واضح کرتا ہے کہ اس قوم کے بعض گروہوں نے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کی، انبیائے کرام علیہم السلام کی مخالفت کی، اور بعض مواقع پر انبیاء کے قتل تک کے جرم کے مرتکب ہوئے۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ ان کی نافرمانیوں کا ذکر کرتے ہوئے فرماتا ہے:

اِنَّ الَّذِیۡنَ یَکۡفُرُوۡنَ بِاٰیٰتِ اللّٰہِ وَ یَقۡتُلُوۡنَ النَّبِیّٖنَ بِغَیۡرِ حَقٍّ ۙ (القرآن، ۳: ۲۱)

یہ اس لیے کہ وہ اللہ کی آیات کا انکار کرتے اور نبیوں کو ناحق قتل کرتے تھے۔

اللہ تعالیٰ کی نعمتیں اور فضیلتیں حاصل کرنے کے باوجود بنی اسرائیل کے بعض طبقات سرکشی اور نافرمانی کا شکار ہوئے۔ حضرت عیسیٰ کے خلاف سازش اور انہیں صلیب پر چڑھانے کے دعوے کا ذکر بھی قرآن مجید میں ملتا ہے، اگرچہ قرآن واضح کرتا ہے کہ حضرت عیسیٰ نہ قتل کیے گئے اور نہ سولی دیے گئے، بلکہ اللہ تعالیٰ نے انہیں اپنی طرف اٹھالیا:

وَّ قَوۡلِہِمۡ اِنَّا قَتَلۡنَا الۡمَسِیۡحَ عِیۡسَی ابۡنَ مَرۡیَمَ رَسُوۡلَ اللّٰہِ ۚ وَ مَا قَتَلُوۡہُ وَ مَا صَلَبُوۡہُ وَ لٰکِنۡ شُبِّہَ لَہُمۡ ؕ (القرآن، ۴: ۱۵۷)

اور ان کے اس کہنے کی وجہ سے کہ ہم نے مسیح عیسیٰ بن مریم کو قتل کر دیا، حالانکہ نہ انھوں نے انھیں قتل کیا اور نہ سولی دی، بلکہ انھیں شبہ میں ڈال دیا گیا۔

رسول اکرم ﷺ کی بعثت کے بعد مدینہ اور اس کے اطراف میں آباد یہودی قبائل کے ساتھ مسلمانوں کے تعلقات بھی اسلامی تاریخ کا ایک اہم باب ہیں۔ جب نبی کریم ﷺ نے انہیں دین کی دعوت دی تو بعض گروہوں نے مخالفت اختیار کی، سازشیں کیں، اور مسلمانوں کے خلاف سیاسی و عسکری محاذ آرائی میں حصہ لیا۔ قرآن مجید نے اہل ایمان کو اس امر سے خبردار کیا کہ وہ ایسے عناصر کو اپنا معتمد اور سرپرست نہ بنائیں جو اسلام اور مسلمانوں کے خلاف دشمنی رکھتے ہوں۔ اس تنبیہ کا مقصد مسلمانوں کی دینی، سیاسی اور اجتماعی حفاظت تھا۔

یہودیوں کے سیاسی رویوں، داخلی اختلافات اور رومی سلطنت کے ساتھ کشمکش کے نتیجے میں ۷۰ عیسوی میں رومیوں نے انہیں فلسطین اور بیت المقدس کے علاقے سے بے دخل کر دیا۔ اس کے بعد یہودی دنیا کے مختلف ملکوں میں منتشر ہو گئے۔ وقت گزرنے کے ساتھ یہودی قوم میں اپنی قدیم سرزمین کی طرف واپسی کا خیال مختلف صورتوں میں موجود رہا۔ انیسویں صدی میں اسی خیال نے ایک منظم سیاسی تحریک کی شکل اختیار کی، جسے صہیونیت (Zionism) کہا گیا۔ اس تحریک کا بنیادی مقصد دنیا بھر میں بکھرے ہوئے یہودیوں کو فلسطین میں جمع کر کے ایک یہودی ریاست قائم کرنا تھا، جہاں حضرت داود اور حضرت سلیمان کی سلطنتوں کی تاریخی یادیں موجود تھیں۔

صہیونی تحریک کے بعض نظریات میں فلسطین تک محدود ریاست کے بجائے ایک وسیع تر یہودی ریاست کا تصور بھی موجود رہا، جسے بعد میں گریٹر اسرائیل کے نام سے تعبیر کیا گیا۔ اس تصور کے تحت فلسطین، شام، لبنان، مصر، سعودی عرب، یمن اور عراق کے بعض علاقوں کو ایک بڑے سیاسی منصوبے کا حصہ سمجھا گیا۔ اس خواب کو حقیقت بنانے کے لیے

صہیونی قیادت نے دنیا بھر کے یہودیوں کو منظم کرنا شروع کیا اور فلسطین کی طرف ہجرت کی تحریک کو تقویت دی۔

یہودیوں کا فلسطین میں آنا کسی ایک وقت کا واقعہ نہیں تھا، بلکہ وہ مختلف ادوار میں گروہوں کی صورت میں وہاں آباد ہونے لگے۔ اہلِ عرب اس بڑی سیاسی تبدیلی کو بروقت نہ سمجھ سکے۔ خلافتِ عثمانیہ کے خاتمے کے بعد عرب دنیا نئی ریاستوں، جدید حکومتوں، داخلی انتظامات اور ترقیاتی معاملات میں مصروف ہو گئی۔ اس دوران فلسطین میں ایک ایسی آبادکاری تیزی سے بڑھتی رہی جس کے دوررس سیاسی نتائج سامنے آنے تھے۔ علامہ اقبال کو یہ خطرہ بہت پہلے دکھائی دے رہا تھا۔ ان کے نزدیک عرب دنیا کی بے خبری اور غفلت مستقبل کے ایک بڑے بحران کی تمہید تھی:

رختِ ہستی از عرب برچیدہ ای
در خُمستانِ عجَم خوابیدہ ای

(اقبال، فارسی: ص۱٦۷)

"عرب سے زندگی کا سامان اٹھالیا گیا، اور یہ خُمستانِ عجم میں سو گیا ہے۔"

یہودیوں نے ۱۹۱۷ء کے بعد فلسطین میں اپنی آبادکاری کو زیادہ منظم انداز میں آگے بڑھایا۔ اگرچہ یورپ میں بھی انہیں الگ ملک دینے کا امکان پیدا کیا جا سکتا تھا، مگر صہیونی قیادت، خصوصاً ڈیوڈ بن گوریان، فلسطین ہی کو یہودی ریاست کے قیام کے لیے مرکزی خطہ سمجھتی تھی۔ یہ ریاست محض ایک قومی پناہ گاہ نہیں تھی، بلکہ ایک ایسا سیاسی منصوبہ تھی جس نے آنے والے زمانوں میں پورے مشرقِ وسطیٰ اور عالمِ اسلام کے امن کو متاثر کرنا تھا۔

جب صہیونی تحریک عروج پر پہنچی تو مسلمانوں میں یہ تشویش پیدا ہوئی کہ مشرق کے دروازے پر مغربی استعمار کا ایک ایسا مرکز قائم کیا جا رہا ہے جو مستقبل میں ایشیائی اور اسلامی ممالک کے لیے مستقل خطرہ بنے گا۔ علامہ اقبال نے اسی خطرے کو محسوس کرتے ہوئے فرمایا:

مشرق کے دروازے پر مغربی استعمار کے اس اڈے (اسرائیل) کی تعمیر اسلام اور ہندوستان دونوں کے لیے خطرے کا باعث ہے۔ (تنولی، ص ۳۳۱)

تاریخی حقائق سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ خلافتِ عثمانیہ اگرچہ اپنے آخری زمانے میں کمزور ہو چکی تھی، مگر پھر بھی امتِ مسلمہ کی سیاسی اور روحانی وحدت کی علامت تھی۔ اسلام دشمن طاقتوں کو اندیشہ تھا کہ اگر کسی بڑے دینی یا سیاسی مسئلے پر خلیفہ کی طرف سے آواز بلند ہوئی تو پوری امت اس پر لبیک کہہ سکتی ہے۔ اسی لیے صہیونی اور مغربی طاقتوں نے سب سے پہلے اسلامی سیاسی وحدت کو کمزور کرنے کی کوشش کی۔ خلافت کے خاتمے کے بعد یہودی آبادکاری کے لیے فضا نسبتاً سازگار ہو گئی، خصوصاً ۱۹۲۰ء سے ۱۹۴۰ء کے درمیان فلسطین میں یہودی آبادی تیزی سے بڑھی۔ عرب دنیا کو اس وقت ہوش آیا جب یہودی فلسطین کے اہم علاقوں میں مضبوطی سے آباد ہو چکے تھے۔

اقبال کے نزدیک فلسطین کا مسئلہ صرف فلسطینیوں یا عربوں کا مسئلہ نہیں تھا، بلکہ پوری امتِ مسلمہ کا مسئلہ تھا۔ انہوں نے اپنی زندگی کے آخری دور میں فلسطین کے حوالے سے ایک جلسے میں خطاب کرتے ہوئے مسلمانوں کو نہایت اہم تنبیہ کی:

میرے لیے اس مختصر سے بیان میں فلسطین رپورٹ پر تفصیل سے بحث کرنا ناممکن امر ہے۔ تاہم کچھ اہم سبق ہیں جو مسلمانانِ ایشیا کو سیکھنے چاہییں۔ تجربے نے صریحاً واضح کر دیا ہے کہ مشرقِ قریب کے لوگوں کی سیاسی سالمیت کا دارو مدار اس بات پر ہے کہ ترکوں اور عربوں میں فوراً دوبارہ اتحاد قائم کیا جائے۔ (صدیقی، ص ۳۱۸)

فلسطین پر صہیونی قبضہ عرب دنیا کی غیرت، حمیت اور سیاسی بصیرت کا ایک بڑا امتحان تھا، مگر عرب قیادت اس امتحان میں کمزور ثابت ہوئی۔ برطانوی استعمار، جس کا عالمی اقتدار آخری سانسیں لے رہا تھا، اس نے اپنی سیاسی میراث کے طور پر مسلمانوں کے مقدس خطے میں ایک ایسا تنازع چھوڑ دیا جو آج تک پورے عالمِ اسلام کو متاثر کر رہا ہے۔ اسرائیل کا قیام محض

ایک ریاست کا قیام نہ تھا، بلکہ مشرقِ وسطیٰ میں ایک مستقل سیاسی بحران کی بنیاد تھی، جس کا مقصد مسلمانوں کو متحد ہو کر ایک مضبوط اسلامی سیاسی نظام قائم کرنے سے روکنا بھی تھا۔

اسرائیل کا باقاعدہ قیام ۱۴ مئی ۱۹۴۸ء کو ہوا۔ اسے علیحدہ ریاست کے طور پر سب سے پہلے امریکہ نے تسلیم کیا، پھر سوویت یونین، برطانیہ، فرانس اور دیگر مغربی ممالک نے بھی اسے قبول کر لیا۔ یوں مغربی استعمار کے اس مرکز کو ابتدا ہی سے عالمی حمایت حاصل ہو گئی۔ جب فلسطینی حقوق کو نظر انداز کر کے اسرائیل قائم کیا گیا تو عرب دنیا میں شدید ردِ عمل پیدا ہوا۔ ۱۹۴۸ء میں عرب ممالک نے اسرائیل کے خلاف جنگ کی، مگر یہ جنگ ناکام رہی اور عربوں کو شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ اس کے بعد مسئلہ فلسطین ایک ایسے بین الاقوامی بحران میں تبدیل ہو گیا جو آج بھی حل طلب ہے۔

اقبال سمجھتے تھے کہ فلسطین کا مسئلہ خلافت کے خاتمے کے بعد عالمِ اسلام کا پہلا بڑا بین الاقوامی مسئلہ ہے، جس نے امت کی غیرت اور اجتماعی ذمہ داری کو للکارا ہے۔ عرب ماضی میں بھی عرب و عجم کو متحد کر چکے تھے، اس لیے اقبال کے نزدیک وہ ایک بار پھر ترکوں، عربوں اور دیگر مسلم اقوام کے درمیان اتحاد پیدا کرنے میں اہم کردار ادا کر سکتے تھے۔ اگر اقوام متحدہ فلسطین کے مسئلے پر انصاف فراہم نہیں کرتی تو عالمِ اسلام کو اپنی ایک مضبوط عالمی تنظیم بنانی چاہیے، جو مسلمانوں کے اجتماعی مسائل کو حل کرنے کی صلاحیت رکھتی ہو۔ موجودہ عالمی نظام میں اقوام متحدہ اسلامی ممالک کے مسائل کے حل میں مؤثر کردار ادا نہیں کر سکی، اس لیے اس پر مکمل انحصار کرنا خام خیالی ہے۔

یہودی فلسطین پر اپنے تاریخی حق کا دعویٰ کرتے ہیں، مگر اقبال اس دعوے کی کمزوری کو تاریخی تناظر میں نہایت بلیغ انداز میں واضح کرتے ہیں:

ہے خاک فلسطیں پہ یہودی کا اگر حق
ہسپانیہ پر حق نہیں کیوں اہل عرب کا

(اقبال، اردو: ص۲۶۸)

## مسئلۂ فلسطین کے اثرات

ارضِ فلسطین کی تاریخ ہزاروں سال پرانی ہے۔ اسے انبیائے کرام علیہم السلام کی سرزمین کہا جاتا ہے۔ اس خطے میں متعدد جلیل القدر انبیاء مبعوث ہوئے۔ بنی اسرائیل نے بھی اس سرزمین پر طویل عرصہ گزارا۔ حضرت داود اور حضرت سلیمان نے یہاں اپنی سلطنت قائم کی۔ بعد ازاں حضرت عیسیٰ کی آمد کے بعد یہ خطہ عیسائی تاریخ کا بھی اہم مرکز بن گیا، اگرچہ یہودی بھی مختلف ادوار میں یہاں آباد رہے۔

۷۰ عیسوی میں رومیوں نے یہودیوں کو اس خطے سے نکال دیا، جس کے بعد وہ یورپ اور دیگر مغربی ممالک میں پھیل گئے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے بعد بیت المقدس مسلمانوں کا قبلۂ اول رہا، جہاں کی طرف مسلمان ابتدائی دور میں رخ کر کے نماز ادا کرتے تھے۔ بیت المقدس یہودیت، عیسائیت اور اسلام تینوں مذاہب کے لیے مقدس مقام ہے، مگر اسلامی عقیدے کے مطابق نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی آمد کے بعد سابقہ شریعتیں منسوخ ہو گئیں اور آخری شریعت نافذ ہوئی۔ اسی بنیاد پر اہلِ اسلام بیت المقدس کو اپنے دینی، تاریخی اور روحانی حق کا حصہ سمجھتے ہیں۔

حضرت عمر فاروق کے دورِ خلافت میں ۶۳۷ء میں ابو عبید بن الجراح کی قیادت میں بیت المقدس کا محاصرہ کیا گیا، اور ایک معاہدے کے تحت شہر کی چابیاں خلیفہ کے سپرد کی گئیں۔ بعد ازاں ۱۰۹۹ء میں پہلی صلیبی جنگ کے دوران عیسائیوں نے بیت المقدس پر قبضہ کر لیا، جو تقریباً ۸۸ سال تک قائم رہا۔ ۱۱۸۷ء میں سلطان صلاح الدین ایوبی نے صلیبیوں کو شکست دی، بیت المقدس کو آزاد کرایا، اور شہر میں داخل ہو کر عام معافی کا اعلان کیا۔ یہ واقعہ اسلامی تاریخ میں عدل، شجاعت اور اعلیٰ اخلاق کی عظیم مثال ہے۔

فلسطین میں یہودی آبادکاری سے لے کر آج تک فلسطینی عوام پر جو مظالم ہوئے، وہ انسانی تاریخ کا نہایت دردناک باب ہیں۔ لاکھوں فلسطینیوں کو ان کے گھروں، زمینوں اور

جائیدادوں سے بے دخل کیا گیا، اور پھر انہیں واپس آنے کا حق بھی نہ دیا گیا۔ ۱۹۴۸ء اور ۱۹۶۷ء کی جنگوں کے بعد اسرائیل نے غزہ، مغربی کنارے اور یروشلیم سمیت فلسطین کے بڑے علاقوں پر قبضہ کر لیا۔ اس کے بعد عرب دنیا پر اسرائیل کا ایسا سیاسی اور عسکری خوف مسلط ہوا کہ اکثر حکومتیں فلسطینیوں کے حق میں مؤثر آواز بلند کرنے سے گریز کرتی رہیں۔

جدید عرب ریاستوں کی مادی ترقی، خوشحالی، تجارت، عمارتوں اور عیش و عشرت کی دوڑ نے فلسطینی عوام کو تنہا چھوڑ دیا۔ عرب حکمرانوں میں سے بہت سے مغربی طاقتوں کے زیرِ اثر آ گئے یا دولت اور اقتدار کے مفادات میں گرفتار ہو گئے۔ علامہ اقبال نے عرب حکمرانوں کے بارے میں بہت پہلے خبردار کیا تھا:

> عربوں کو یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ وہ اب ان عرب بادشاہوں پر اعتماد نہیں کر سکتے جو مسئلہ فلسطین کے متعلق ایک آزادانہ اور ایماندارانہ فیصلہ کرنے سے قاصر ہیں عربوں کا فیصلہ پورے غور و خوص کے بعد ایک آزادانہ فیصلہ ہونا چاہیے۔ (تنولی، ص ۳۳۰)

آج مسئلہ فلسطین کے حل کی اہمیت پہلے سے کہیں زیادہ بڑھ چکی ہے۔ فلسطینی بچے، عورتیں، بوڑھے اور عام شہری مسلسل اسرائیلی جارحیت کا نشانہ بن رہے ہیں۔ ۷ اکتوبر ۲۰۲۳ء کو شروع ہونے والی اسرائیل اور غزہ فلسطین کی جنگ نے دنیا بھر کے باضمیر انسانوں کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ یہ جنگ مسلسل تباہی، محاصرے، بمباری، بے گھری، بھوک، بیماری اور انسانی المیے کی صورت اختیار کر چکی ہے۔ ہزاروں معصوم جانیں ضائع ہو چکی ہیں۔ محفوظ مقامات کی طرف جانے والے پناہ گزین بھی فضائی حملوں سے محفوظ نہیں رہے۔ خوراک، ادویات اور بنیادی سہولتوں کی شدید قلت نے انسانی بحران کو مزید سنگین بنا دیا ہے۔

ان حالات میں سب سے پہلے اہلِ عرب پر فرض تھا کہ وہ فلسطینیوں کی مدد کو پہنچتے۔ معصوموں کی چیخیں، بچوں کی لاشیں، تباہ شدہ گھر، اجڑے ہوئے خاندان اور بمباری کے مناظر دیکھنے کے باوجود عرب حکمرانوں کی خاموشی امت کے لیے ایک بہت بڑا سوال ہے۔ اسے

کمزوری کہا جائے یا بے حسی، حقیقت یہ ہے کہ فلسطین کے معاملے میں عرب حکمران اقبال کی تنبیہات کے عین مطابق غیر مؤثر ثابت ہوئے۔ اقبال نے پہلے ہی خبردار کیا تھا کہ عرب بادشاہوں پر مکمل بھروسہ نہیں کیا جا سکتا، کیونکہ وہ فلسطین کے معاملے میں آزادانہ اور ایماندارانہ فیصلہ کرنے سے قاصر ہو سکتے ہیں۔

او بفکرِ مرکز و تو در نفاق
بگذر از شام و فلسطین و عراق

(اقبال، فارسی: ص ۶۵۰)

"وہ خود تو کسی مرکز کی فکر میں ہے اور تیرے اندر پھوٹ پڑی ہوئی ہے، شام اور فلسطین اور عراق (کی حد بندیوں) سے بلند ہو جا۔"

اقبال اس شعر میں امت کو علاقائی تقسیم سے بلند ہونے کا پیغام دیتے ہیں۔ وہ بتاتے ہیں کہ دشمن اپنے لیے مرکزیت پیدا کر رہا ہے، مگر مسلمان شام، فلسطین، عراق اور دیگر جغرافیائی شناختوں میں بٹے ہوئے ہیں۔ اگر مسلمان اسی تقسیم میں گرفتار رہے تو سب کا انجام ایک جیسا ہو گا۔ آج دنیا نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ پہلے شام کو تباہ کیا گیا، پھر عراق کو جنگ، قتلِ عام اور انتشار کا نشانہ بنایا گیا، اور اب فلسطین لہو لہو ہے۔

اس وقت عالمِ اسلام نہایت مشکل دور سے گزر رہا ہے۔ اندرونی انتشار، فرقہ واریت، قومیت، سیاسی کمزوری، معاشی انحصار اور بیرونی حملوں نے مسلمانوں کو مایوسی، خوف اور بے بسی کی کیفیت میں مبتلا کر دیا ہے۔ اسرائیل ایک چھوٹی سی ریاست ہونے کے باوجود عالمی حمایت، عسکری قوت، میڈیا اثرات اور مسلم دنیا کی تقسیم کے باعث کروڑوں عربوں اور تقریباً دو ارب مسلمانوں پر دباؤ قائم کیے ہوئے ہے۔ ستاون اسلامی ممالک کے باوجود امت فلسطین کے لیے مؤثر عملی کردار ادا کرنے میں ناکام دکھائی دیتی ہے۔ دنیا کمانے کی حرص، مغرب کی تقلید اور مادیت پرستی نے مسلمانوں کو اس حال تک پہنچا دیا ہے کہ وہ اپنے اوپر ہونے والے ظلم کے خلاف بھی منظم آواز بلند نہیں کر پاتے۔

جانتا ہوں میں یہ امت حاملِ قرآں نہیں
ہے وہی سرمایہ داری بندہ مومن کا دیں

(اقبال، اردو: ص ۷۱۲)

مسلمانوں نے جب سے مال و دولت، آسائش، اقتدار اور دنیاوی مفادات کو اپنا اصل مقصد بنا لیا ہے اور اللہ تعالیٰ کے احکامات کو پسِ پشت ڈال دیا ہے، تب سے ان میں جرات، غیرت، بہادری اور اجتماعی حمیت کمزور پڑتی گئی ہے۔ دنیا کمانے کا شوق اس حد تک بڑھ گیا کہ اللہ تعالیٰ کی رضا، دین کی سربلندی اور امت کی وحدت ثانوی حیثیت اختیار کر گئے۔ اسی کا نتیجہ زلت، رسوائی اور بے بسی کی صورت میں سامنے ہے:

دیں ہاتھ سے دے کر اگر آزاد ہو ملت
ہے ایسی تجارت میں مسلماں کا خسارا

(اقبال، اردو: ص ۷۱۴)

# کتابیات


۱. اقبال احمد صدیقی(مترجم)، (۲۰۲۱ء)، علامہ اقبال تقریریں، تحریریں اور بیانات، لاہور: اقبال اکادمی پاکستان

۲. سید نذیر نیازی، (۲۰۱۲ء)، اقبال کے حضور: نشستیں اور گفتگوئیں، لاہور: اقبال اکادمی پاکستان

۳. ڈاکٹر طاہر حمید تنولی، (۲۰۱۳ء) معاصر تہذیبی کشمکش اور فکر اقبال، لاہور: اقبال اکادمی پاکستان

۴. علامہ محمد اقبال، (۱۹۹۰ء)، کلیات اقبال(فارسی)،،لاہور: شیخ غلام علی اینڈ سنز

۵. علامہ محمد اقبال، (۲۰۱۸ء)،کلیاتِ اقبال(اُردو)،لاہور:اقبال اکادمی پاکستان

۶. محمد اکرام الحق چوہدری، خطبہ حجۃ الوداع، لاہور: ڈیفنس سوسائٹی